کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

ارمغان کیریلا۔ از جناب ایس، ایم سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، قیمت ۷۵ پیسے، پتہ: ایس، ایم سرور صاحب پوسٹ منڈو پرمبا، ملاپرم، کیریلا۔

جناب ایس، ایم سرور صاحب کا وطن ملاپرم، کیریلا اور مادری زبان ملایالم ہے، مگر اردو کی کشش نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اپنی موزونی طبع سے اس میں شاعری بھی کرنے لگے، ارمغان کیریلا ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں ۴۲ نظمیں ہیں، جو قومی و ملی درد اور اسلامی جذبات کی ترجمان ہیں، اس لیے ان کے کلام میں اقبال کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن اردو سرور صاحب کی مادری زبان نہیں ہے، اس لیے زبان و طرز ادا میں کہیں کہیں خامی ہے، جو رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی، مصنف اس لحاظ سے قابل تعریف ہیں کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اردو میں اتنی قدرت حاصل کرلی۔

فضائل علم و مناقب علما۔ مرتبہ مولانا صدر الدین عامر الانصاری صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۲، مجلد مع گردپوش، قیمت ۳؎، پتہ: ادارہ باب العلوم، مزمل منزل، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں علم دین کی فضیلت و اہمیت اور اہل علم کے مناقب بیان کیے گئے ہیں، پہلے علم و علما، کی فضیلت و منقبت میں وارد قرآنی آیات مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں، پھر اس سے متعلق حدیثیں درج کرکے ان کا ترجمہ اور آسان زبان میں انکی تشریح کی ہے، علم دین سے بے اعتنائی اور لاپروائی کے زمانہ میں اس کتاب کی اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۰ - ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء - عدد ۳

مضامین

شذرات

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یوں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں مگر ان میں تین زیادہ اہم ہیں، ابتدائی تعلیم، اردو زبان، اور مسلم یونیورسٹی، ان تینوں کے بارہ میں حکومت کی پالیسی صحیح نہیں ہے، ابتدائی تعلیم کا نصاب تمامتر اکثریت کے مذہب اور کلچر کا ترجمان ہے جو مسلمانوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہے، ان کے احتجاج اور حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے باوجود نہیں بدلا گیا، اور مسلمان بچے اسکو پڑھنے پر مجبور ہیں، مسلمانوں نے اسلامی مکاتب قائم کرکے اس کی تلافی کی کوشش کی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ حکومت کے نظامِ تعلیم کے متوازی نظام قائم نہیں کر سکتے جس سے ان کو بڑا تعلیمی نقصان پہنچ رہا ہے، مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کا کام تھا، ایک سیکولر حکومت کا فرض کیا ہے،

اردو کی حق تلفی کا اعتراف فرقہ پرست پارٹیوں کے علاوہ اکثریت کے بھی ہر طبقہ کو ہے، اور اسکی حمایت میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اس لیے اب مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، مرکزی حکومت نے اردو بورڈ قائم کیا ہے، اور دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے بھی ایک کروڑ کی رقم منظور کی ہے، اردو کے مسائل کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو مختلف ریاستوں کا دورہ کرکے ان مسائل کا جائزہ لے رہی ہے، اتر پردیش کی حکومت نے اردو اکیڈمی قائم کی ہے، اور اردو کی تعلیم کیلئے وقتاً فوقتاً احکام جاری کرتی رہتی ہے، اور اس کی نگرانی کے لیے ایک آفیسر بھی مقرر کیا ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترقی کی جو واقعی شکل ہے، اس کو نہ مرکزی حکومت اختیار کرتی ہے اور نہ صوبائی حکومتیں،

اصل مسئلہ اردو کی قانونی حیثیت کا ہے، جب تک یہ متعین نہ ہوگی، ساری تدبیریں بے کار ہیں، حکومت کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اردو کے معاملہ میں اس کے پورے عملہ کی ذہنیت

خراب ہے، اور اس سے کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوتا، اس لیے اردو کے بارہ میں اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی،

دوسرے اردو کی تعلیم کا جو فارمولا بھی بنایا جاتا ہے اس میں بھی بہانہ جوئی اور اردو کا راستہ روکنے کی پوری گنجایش رہتی ہے، چنانچہ سہ لسانی فارمولا اس لیے بنایا گیا تھا کہ علاقائی زبانوں کی تعلیم کی گنجایش نکل سکے لیکن اتر پردیش کی حکومت نے اس میں سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ بند کر دیا، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا اصول سب کے نزدیک مسلّم ہے، لیکن دس اور چالیس فی صدی طلبہ کی قید نے اردو کی تعلیم عملاً ناممکن بنادی ہے، جہاں یہ تعداد پوری بھی ہوجاتی ہے، وہاں بھی مختلف بہانوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاتا، ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی یہی حال ہے، بلکہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اسکول کے منتظمین اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے ہیں، مگر افسران بالا اس میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں، ان ساری مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، خاص طور سے اتر پردیش اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے یا کم سے کم آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی اور اہم سرکاری کاموں میں اردو کا استعمال ضروری قرار دیا جائے، اس کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے، اب آخری امید گجرال کمیٹی سے ہے، دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے،

مسلم یونیورسٹی ایکٹ: نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ جمہوری نقطۂ نظر سے بھی قابل ترمیم ہے، اس سے اس کا اقلیتی کردار ہی ختم نہیں ہوگیا بلکہ اسکی آزادی بھی سلب ہوگئی، وائس چانسلر کو مختار کل بنادیا گیا ہے، اور اس کا انتخاب حکومت کریگی، کورٹ، اکزیکیٹو کونسل، اکیڈمک کونسل سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی کثرت ہے، کورٹ کی حیثیت جو سب سے بڑی اور بااختیار مجلس تھی

اب صرف مشیر کی رہ گئی ہے، یونین کی موجودگی میں طلبہ کی کونسل کا قیام ایک مستقل فتنہ ہے، غرض اب مسلم یونیورسٹی وزارت تعلیم کا ایک ماتحت شعبہ بن گئی ہے اسلیے اب یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں رہا بلکہ آزادی اور جمہوریت کے تحفظ کا بن گیا ہے، اسی لیے کانگریس کے علاوہ ساری پارٹیاں اس کی مخالفت میں شریک ہیں، مسلمانوں میں ان کے علاوہ جن کے اغراض حکومت سے وابستہ ہیں، کوئی بھی اسکا حامی نہیں، جنکی حیثیت حکومت کے کارندوں سے زیادہ نہیں ہے، وہ حقیقۃً حکومت کے بھی مخلص نہیں، ان کا مقصد صرف اظہار وفاداری ہے، وہ اپنے غلط مشوروں سے حکومت کو بھی مشکل میں پھنسا دیتے ہیں، ان کا کردار یہ ہے کہ ایک طرف وہ مسلمانوں کے ترجمان بنتے ہیں، مگر پھر حکومت کا منشا دیکھکر اس کے ہمنوا بنجاتے ہیں، چنانچہ اس طبقہ کے مسلمان وزراء سے لیکر پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران تک برابر اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کا یقین دلاتے رہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائیگا بلکہ وزیر اعظم کو اس کے لیے میمورنڈم بھی پیش کیا، مگر جب اس کے خلاف ایکٹ بن گیا تو اس کے پرزور وکیل بن گئے، ایسے لوگوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، حقیقۃً وہ حکومت کے اعتبار کے بھی قابل نہیں، مگر اس کو کام ان ہی سے لینا ہے،

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اگر دب بھی جائے تو اس کا زخم مسلمانوں کے دلوں سے مندمل نہ ہوگا اور ناسور بنکر رستا رہے گا جو نہ ملک کے لیے مفید ہے اور نہ خود مسلمانوں کیلیے، دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ حکومت اس کو اپنے وقار کا سوال نہ بنائے اور اس میں ایسی ترمیم کردے کہ کم سے کم یونیورسٹی کی آزادی باقی رہے، جب دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کا ایکٹ بنے گا تو اتنی ترمیم بہرحال کرنا پڑے گی، اگر پہلے سے یہ ترمیم کردیجائے تو مسلمانوں کی بھی دلجوئی ہوجائے گی، جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے جو ترمیمیں پیش کی ہیں وہ بہت مناسب ہیں، اس سے حکومت کو سچے قوم پرور مسلمانوں کے جذبات کا بھی اندازہ ہوگا۔

مقالات

بعض شبہات اور اُن کا جواب

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مسلمانوں کے اعمال و کردار اور اُن کے زوال و پستی اور ان کے مقابلہ میں مغربی قوموں کی ترقی کو دیکھکر اکثر دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ دور کے مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کی ضروریات کی کفالت سے قاصر ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو پوری مسلمان قوم پر کیوں زوال طاری ہے، اور وہ ہر شعبۂ زندگی میں انحطاط میں کیوں مبتلا ہے، اور مغربی قوموں کی ترقی روز افزوں ہے، اس لیے ان کا نظام حیات ہی قابل تقلید ہے،

بظاہر یہ خیال باوزن ہے، لیکن صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے، ہر نظام حیات کا ایک مقصد اور نصب العین ہوتا ہے، اسی کے مطابق اس کی ترتیب عمل میں آتی ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے سارے یا کم از کم اہم اجزاء پر عمل ضروری ہے، ورنہ اس سے مطلوب نتائج برآمد نہ ہوں گے، اس کی مثال مشین کی جیسی ہے، جس کے سارے پرزے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور مشین اسی وقت کام دے سکتی ہے جب یہ سب پرزے اپنی جگہ پر ٹھیک چل رہے ہوں،

ورنہ پوری مشین معطل ہو جائے گی، اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عمل اسلامی تعلیمات پر کہاں تک ہے، دوسرا بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مغربی تہذیب سراسر خیر ہے، اور وہی انسانی تہذیب و ترقی کا اصلی معیار ہے، اور اس کے سارے عناصر قابل تقلید ہیں،

اسلام مستقل ایک نظام حیات ہے، وہ دنیا کے کسی نظام کا مقلد نہیں، اس کے ظہور کے وقت دنیا میں دو بڑی پُرشوکت اور متمدن سلطنتیں ایران و روم کی موجود تھیں، جن کی حکومت مشرق و مغرب کے بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور وہ مادی حیثیت سے ایک اعلیٰ تمدن کی مالک تھیں، اس زمانہ میں ان کی وہی حیثیت تھی، جو آج مغربی قوموں اور ان کی تہذیب کی ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی کی تقلید نہیں کی، اور اپنا مستقل نظام حیات بنایا، جو ان نظاموں سے نہ صرف مختلف بلکہ ان کی ضد اور ان کے لیے پیام موت تھا، اسکے عقائد تصورات، زندگی کا نصب العین، نظام معاشرت ہر چیز ان نظاموں سے مختلف تھی، اس نے ہر قسم کے شرک کی مخالفت کی، اور ملت اسلامیہ کی بنیاد شرک اور اوہام پرستی کے بجائے توحید، غیر اللہ سے بے خوفی، نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر اسلامی اتحاد، انسانی غلامی اور طبقاتی تقسیم کے بجائے آزادی اور عدل و مساوات، نسلی برتری کے بجائے عمل صالح پر رکھی، اس طرح اس نے اس دور کے سارے بتوں کو توڑ دیا،

اس نے قومی سربلندی اور مادی ترقی کے بجائے خدا شناسی، معرفت حق، رذائل اخلاق کے ترک اور فضائل اخلاق سے آراستگی، نیکی اور بھلائی کی تبلیغ اور بدی اور برائی کے ترک کو اس نظام حیات کا مقصد قرار دیا، کلام پاک کی آیات ان احکام و ہدایات سے معمور ہیں، مسلمانوں کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے:

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (حج)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو وہ نمازیں پڑھیں گے زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دینگے اور بری باتوں سے روکیں گے،

دوسری آیت میں ہے:-

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے ہو، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

یہ وصف کسی آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ ان کا نصب العین دنیاوی اور مادی ترقی ہے، لیکن اسلام نے ان میں جو روح پیدا کر دی تھی اور جو نظام حیات بنایا تھا، اس پر عمل کا لازمی نتیجہ دنیاوی شوکت و عظمت ہے، خود قرآن مجید کا وعدہ ہے "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" اگر تم سچے مسلمان ہو تو تم کو ہر طرح کی سربلندی حاصل ہوگی،

دوسری آیت میں ہے

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (نور)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین کی حکومت ضرور دیگا جس طرح تمہارے پہلے کے لوگوں کو دی تھی اور جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے جما کر رہیگا اور خوف کے بعد ان کو امن دیگا

یعنی دین و دنیا دونوں کی بھلائی ایمان اور عمل صالح پر منحصر ہے، جب تک مسلمان
میں یہ وصف رہا، خدا کا وعدہ پورا ہوا، اسلام نے ان میں ایسی روح اور خدا کی راہ
میں جانبازی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ انھوں نے اس دور کی سب سے بڑی ایران
اور روم کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ان کے ملک کے وارث بنے،

یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کا لازمی نتیجہ ہے، اسلام
دین و دنیا کا جامع ہے، اس کی دعا ہی یہ ہے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة
حسنة" حدیث میں ہے کہ "دنیا کا کام اس انہماک سے کرو کہ تم کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے،
اور دین کا کام اس انہماک سے کرو کہ کل ہی مرجانا ہے"، اسلام محکومیت کے لیے آیا
ہی نہیں، اس لیے اس میں محکومی کی زندگی کے قوانین ہی نہیں ہیں، اس کا مقصد دنیا
میں خدائی قانون کا نفاذ ہے، چنانچہ جیسے ہی اس میں طاقت آئی، اس نے حکومت الٰہیہ
کی بنیاد رکھ دی، اس لیے اس نے مذہبی تعلیمات کے ساتھ ان اصول و قوانین کی
تعلیم بھی دی ہے جن پر قوموں اور ملتوں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کا دارومدار
ہے، چنانچہ کلام مجید میں جس طرح عقائد و عبادات وغیرہ کی تعلیم ہے، اسی طرح
اسلامی نصب العین پر اعتقاد جازم، اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد و توکل، اس کے سوا
ہر طاقت سے بے خوفی، اسلامی وحدت و اخوت، عدل و مساوات، انفاق فی سبیل اللہ
جہاد یعنی دین و ملت کی راہ میں ہر قسم کی جد و جہد اور جانی و مالی قربانی، مادی طاقت
کے حصول اور ان ساری چیزوں کی تعلیم اور ان پر عمل کی تاکید ہے، جو اسلام اور
ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں، یہ اصول مسلمانوں کے ساتھ مخصوص
نہیں، بلکہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ دنیا میں کامیاب و سربلند ہوگی، فرق یہ ہے کہ

قرآن مجید نے ان اصولوں کو مذہبی زبان میں ادا کیا ہے، مسلمانوں کا مقصد
دین و دنیا دونوں کی سربلندی ہے، اور دوسری قوموں کا مقصد صرف مادی ترقی
اور قومی سربلندی ہے،

آج ان میں سے کس اصول پر مسلمانوں کا عمل ہے، بیشک کلمہ گو کی حیثیت
سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اسلام پر ان کا وہ ایمان نہیں جو ان کو خدا کے
سوا دنیا کی ہر طاقت سے بے خوف کر دے، ملی مفاد کے بجائے ذاتی اغراض
ہیں، سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے، راحت طلبی اور تن آسانی ہے، وہ اسکی
راہ میں ادنیٰ زحمت بھی برداشت نہیں کر سکتے، ملی وحدت کے بجائے اختلاف
اور گروہ بندی اور نسل و وطن کی پرستش ہے، تفریحی اور لایعنی مشاغل میں ہزاروں
روپے برباد کر دیتے ہیں، اور قوم و ملت کی راہ میں حقیر رقم صرف کرنے کی بھی
توفیق نہیں ہوتی، بڑی بڑی شخصیتیں ذاتی جاہ و اقتدار کیلئے بڑے سے بڑے ملی مفاد
کو قربان کر دیتی ہیں، جس کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، ایسی حالت میں جب
دنیاوی ترقی کے اسلامی اصولوں پر بھی ان کا عمل نہیں ہے، وہ کس طرح دنیا میں
کامیاب ہو سکتے ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی، عریانی و عیش پرستی،
جنسی بے راہ روی اور شراب اور جوا نہیں بلکہ انکی قومی وحدت، ذاتی مفاد پر قومی
مفاد کو ترجیح، اس کے لیے ایثار و قربانی، اپنے مقصد کے حصول کے لیے جانبازی،
علوم و اکتشافات کی راہ میں جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی ہے، انھوں نے
مادی ترقی اور قومی سربلندی کو زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے، اور اس کی راہ میں

کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتیں، اس لیے اس مقصد میں وہ کامیاب ہیں، مسلمانوں میں یہ وصف بھی نہیں، وہ اپنے مذہب و ملت کے لیے ان کی عشر عشیر قربانی نہیں کرسکتے جتنی مغربی قومیں دنیاوی ترقی کے لیے کرتی ہیں، اسی لیے وہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں،

وہ مغربی تہذیب کے اندھے مقلد ہیں، ان کو مغربی قوموں کی خوبیوں کی تقلید کی توفیق نہیں ہوتی، صرف ان کے ظواہر اور ان کے عیوب کے نقال ہیں، چنانچہ ان میں مغرب زدہ تو بکثرت ملیں گے، لیکن ان کے جیسے جانباز، مغربی علوم کے ماہر، سائنسی علوم و اکتشافات کے محقق و موجد مشکل سے نکلیں گے،

اسلام کا اصل مقصد دین و دنیا دونوں میں مسلمانوں کی فلاح تھی لیکن مغربی قوموں کی طرح انھوں نے بھی حکومت اور مادی ترقی کو نصب العین بنا لیا ہے، اور انھی کے خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے اس سے تہی دامن ہیں، اس لیے اس سے بھی محروم ہیں، حکومت و سلطنت، علوم و فنون، سائنس کے ایجادات و اختراعات خیر بھی ہیں اور شر بھی، اس کا دار و مدار نقطۂ نظر کی صحت اور عدم صحت پر ہے، صحیح اور متوازن انسانی ترقی کے لیے، اخلاقی نقطۂ نظر، عارفانہ بصیرت، اعلیٰ انسانی اقدار کا احترام اور مادیت و روحانیت میں توازن ضروری ہے، ورنہ یہ ساری چیزیں انسانیت کے لیے وبال بنجاتی ہیں، جس کا مشاہدہ موجودہ تہذیب و ترقی میں کیا جاسکتا ہے، اگر ایک طرف سائنس کی ایجادات نے انسانیت کی خدمت کی ہے تو دوسری طرف اس کو ہلاکت کے دہانہ پر بھی پہنچا دیا ہے، روحانیت کے فقدان اور اخلاقی قیود

سے آزادی نے مغربی قوموں کو حیوانیت میں غرق کردیا ہے، جس پر وہ تحریکیں شاہد ہیں، جن کا انسانی شرافت کے لیے تصور میں لانا بھی ناگوار ہے، جہاں تک مغربی قوموں کی خوبیوں، ان کے کردار و قوت عمل، علوم و اکتشافات حکومت کے اداروں کی تنظیموں کا تعلق ہے، یقیناً قابل تقلید ہیں، اس کے بغیر آج کسی قوم کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، لیکن خیر و شر کے امتیاز کے بغیر ہر شعبۂ زندگی میں ان کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے ملی خودکشی ہے، دوسری قوموں کی اچھی اور مفید چیزوں سے استفادہ ان کی خصوصیت رہی ہے، خود رسول اکرمؐ نے بعض غزوات میں ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کو اختیار فرمایا اور لباس میں ان کی بعض چیزیں پسند فرمائیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکومت کے اداروں کی تنظیم میں ایرانیوں اور رومیوں کے نظام سے فائدہ اٹھایا، دوسری قوموں کے علوم کی تحصیل مسلمانوں نے بنی امیہ ہی کے زمانہ سے شروع کردی تھی، اور بنی عباس اور بنی امیۂ اندلس کے زمانہ میں سارے علوم و فنون کے امام بن گئے اور ان کو اوج کمال تک پہنچا دیا، انکی مختلف شاخوں میں نئے نئے تجربات و اکتشافات کیے، ہر فن پر سیکڑوں کتابیں لکھیں اور ان فنون کی روشنی یورپ میں پھیلائی، انھی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا ہے، ہمارا مقصد ان کی علمی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں دوسری قوموں کی مفید چیزوں سے استفادہ کیا ہے، اس زمانہ میں اس کی اور بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ بعض پہلوؤں سے مذہب کی بھی پوری خدمت نہیں ہوسکتی،

مگر انھوں نے دوسری قوموں کی جو چیزیں بھی اختیار کیں، اس کی روح میں

بہ نہیں گئے، بلکہ اس کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے دین و ملت کی خدمت
کا کام لیا، وہ منطق و فلسفہ پڑھتے تھے، مگر بسم اللہ سے شروع کرتے تھے، اور اس سے
مذہبی عقائد کے اثبات کا کام لیتے تھے، اور جہاں فلسفہ مذہب سے متصادم ہوتا، اسکا
دلائل سے رد کرتے تھے، اطبا نسخہ کی پیشانی پر ہو الشافی لکھتے تھے، ہیئت یعنی
افلاک کے نظام میں ان کو خدا کی عظمت و کبریائی نظر آتی تھی، تہذیب و معاشرت
میں بھی ان کا طریقہ یہی تھا، آج بھی مسلمانوں کا عمل یہی ہونا چاہیئے، ان کا
منصب و مقام دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ ان کی رہنمائی ہے۔

لیکن مغربی تہذیب کا سیلاب اتنا پُر زور ہے اور اس میں نفس کی
تسکین کا اتنا سامان ہے کہ ساری قومیں اس میں بہی چلی جا رہی ہیں، اور اپنے
عقائد، اعمال، افکار و تصورات، نظام معاشرت ہر چیز کو اسی قالب میں ڈھال
دینا چاہتی ہیں، مغربی تہذیب ہی، تہذیب و شائستگی کا معیار بن گئی ہے، دوسرے
قوموں کو اس میں اس لیے دشواری نہیں ہوتی کہ انھوں نے مذہب سے
آزادی حاصل کر لی ہے، یا اس کو دنیاوی حالات کا تابع بنا دیا ہے یا
عبادت گاہوں میں محدود کر دیا ہے، اور وہ بھی صرف چند رسوم تک محدود ہے،
زندگی کے معاملات و مسائل سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے، بعض مذاہب محض
معاشرتی نظام ہیں، ان کے کوئی بنیادی عقائد نہیں جن کا ماننا ضروری ہو، ان
میں بڑی وسعت ہے اور وہ ہر قالب میں ڈھل سکتے ہیں، اس لیے ان کو نیا قالب
اختیار کرنے میں دقت نہیں ہوتی، اس کے مقابلہ میں اسلام ایک مکمل نظام حیات
ہے، جس سے زندگی کا کوئی پہلو بھی باہر نہیں ہے، وہ دین توحید ہے، اس لیے اپنے

پیرووں کی پوری زندگی میں ایسی وحدت و یکرنگی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسری
قوموں میں ممتاز نظر آئیں اور فوج کی طرح اسلامی قوانین کے ایسے پابند ہوں کہ
حزب اللہ معلوم ہوں اور دوسری قومیں ان سے سبق حاصل کریں،

لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور وہ ساری دنیا کے لیے آیا ہے،
اور مختلف ملکوں اور قوموں کے جغرافی و طبعی حالات اور تہذیب و تمدن میں
بڑا اختلاف ہے، جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑنا ضروری ہے، پھر ہر زمانہ میں نئے نئے
مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کی نظیر اسلامی قوانین میں موجود نہیں ہوتی،
اس لیے اسلام نے بنیادی وحدت کے ساتھ فروعات میں کثرت کی پوری گنجائش
رکھی ہے، عقائد و عبادات وہ بنیادی عناصر ہیں جن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں،
لیکن معاملات اور معاشرات میں تبدیلی کی گنجائش ہے مگر انہیں بھی اُن چیزوں میں
جن پر ملت اسلامیہ کے تشخص اور انفرادیت کا دارومدار ہے اور جن کے متعلق
کلام مجید اور احادیث نبوی میں صریح احکام ہیں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اس سے
اس کی انفرادیت اور اس کا ملی وجود ختم ہو جائے گا اور وہ دوسری قوموں میں
ضم ہو جائے گی، لیکن معاملات و معاشرات کے دوسرے پہلوؤں میں خود شریعت نے
زمانہ کے حالات کی رعایت رکھی ہے، مثلاً جن احکام کی علت بیان کر دی گئی ہے
جب وہ علت باقی نہ رہے گی تو حکم بھی باقی نہ رہے گا، اس سے بہت سے مسائل
میں تبدیلی ہو جائے گی، اسی طریقہ سے مصالح عامہ اور عرف و عادت کا بھی اعتبار
کیا ہے، ان کے لحاظ سے بھی بعض احکام بدل جائیں گے، اور اس پر ہر زمانہ کے
علماء و مجتہدین کا عمل رہا ہے، بعض مسائل کا حل خود مذاہب فقہ میں سے کسی نہ کسی

مذہب میں نکل آئے گا، معاشرات میں تو معاملات سے بھی زیادہ وسعت ہے،
مسلمانوں نے ہر زمانہ میں دوسری قوموں کی ان تہذیبی چیزوں کو جو کسی صریح اسلامی
حکم کے خلاف نہیں ہیں، اختیار کیا ہے، اور ان کو اسلامی مزاج کے مطابق بنا لیا،
چنانچہ ایرانیوں کی قریب قریب پوری تہذیب اختیار کر لی لیکن اس پر اسلام کی
ایسی گہری چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تہذیب کہلانے لگی، آج بھی مختلف ملکوں کے
مسلمانوں میں اسلام کے بنیادی عناصر میں وحدت کے ساتھ تہذیبی کثرت کا جلوہ
دیکھا جا سکتا ہے، ان سب کا کلچر تو ایک ہے لیکن تہذیبی نقش و نگار جدا جدا ہیں،

شریعت کا منشا سختی اور تنگی نہیں بلکہ امت اسلامیہ کی دینی و دنیوی فلاح کے ساتھ
اس کی مصلحت اور سہولت ہے، جس سے بھی یہ چیزیں حاصل ہوں، وہ شریعت کے
دائرے سے باہر نہیں، لیکن شریعت میں مصلحت اور سہولت کا معیار، خواہش نفس،
تعیش، زمانہ کا مذاق و رجحان نہیں ہے کہ ایک چیز نفس کی خواہش کے مطابق ہے،
یا زمانہ میں چل پڑی ہے، اور اس کو قبول عام حاصل ہے، یا تہذیب جدید میں پسندیدہ
ہے، اس لیے اسلامی قانون کو بھی اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے، اگر یہ معیار
مان لیا جائے تو شریعت کا کوئی حکم اپنی جگہ پر باقی نہ رہے گا، اور محرمات کو بھی
جائز کرنا پڑے گا بلکہ صحیح معیار یہ ہے کہ اس کے بغیر حقیقۃً مسلمانوں کو سیاسی،
اقتصادی یا معاشرتی حیثیت سے نقصان پہنچنے یا دشواری میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو،
ایسے مسائل کا حل سب کے نزدیک ضروری ہے، لیکن یہ محض اٹکل پچو نہ ہوگا،
بلکہ اس کے لیے شریعت نے اصول کلیہ بنا دیے ہیں، ان کی روشنی میں ان کا حل
نکالا جا سکتا ہے، اور ہر زمانہ کے علماء و مجتہدین ان کا حل نکالتے رہے ہیں،

آج بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن اس کا حق صرف ان لوگوں کو ہے
جو اسلام کے مزاج شناس ہیں، کتاب و سنت، عمل صحابہؓ، ان کے اور
ائمہ و مجتہدین کے فتاویٰ اور اجتہادات پر ان کی پوری نظر، اور اس میں بصیرت حاصل ہے،
ہر شخص اس کا مجاز نہیں ہے، دنیاوی قوانین میں بھی ان کے ماہرین ہی کی رائے
معتبر مانی جاتی ہے، اور ان ہی کی رائے و مشورے سے قانون بنتے اور ان میں
ترمیم ہوتی ہے، بلکہ دنیا کے سارے معاملات میں ماہرین ہی کی رائے معتبر
مانی جاتی ہے، اس لیے جدید مسائل کے حل میں بھی قانون شریعت کے ماہرین
ہی کی رائے معتبر ہوگی،

لیکن اس دور کے مجتہدین کا مقصد مسائل کا اسلامی حل نہیں ہے، بلکہ اسلامی
قوانین کو کھینچ تان کر جدید مسائل کے مطابق بنانا ہے، اس لیے وہ عربی جاننے
تک کی ضرورت نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک ہر شخص کو اجتہاد کا حق ہے، اس
آزادی رائے کا جو انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

آج کل جو نئے مسائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے
مسلمانوں کا حقیقۃً کوئی نفع و نقصان متعلق نہیں ہے بلکہ وہ تہذیب جدید کی صدائے
بازگشت ہیں، تاہم ایسے مسائل کے وجود سے انکار نہیں، ان کے حل کی صحیح
شکل یہ ہے کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ دیندار مسلمان مل کر ان مسائل کی
ایک فہرست تیار کریں، پھر جو مسئلہ جس فن یا جس شعبہ سے متعلق ہو اس کے
ماہرین اور علماء مل کر اس کا حل نکالیں، اب یہ کام زیادہ دشوار نہیں رہ گیا،
اس پر بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، مصر و شام وغیرہ میں جدید فقہ اور اصول فقہ پر بعض

اچھی اور مستند کتابیں لکھی جاچکی ہیں، اسلامی ملکوں نے جدید مسائل کو جس طرح حل کیا ہے، وہ سب نگاہ کے سامنے ہے، گو یہ سب قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان نے کئی جلدوں میں مجموعۂ قوانین اسلام شائع کیا ہے، اس میں بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے، خود ہندوستان میں جب سے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، بہت سے مفید او رمحققانہ مضامین نکل چکے ہیں، مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی نے اس موضوع پر بہت قابل قدر مضامین اور بعض مفید کتابیں لکھی ہیں، ادارۂ تحقیقات شرعیہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے بھی کچھ کام کیا ہے، پرسنل لا پر غور و فکر کیلئے مولانا محمد طیب صاحب نے علماء کا ایک اجتماع کیا تھا جس کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے اب یہ راہ آسان ہوگئی ہے، ضرورت ہے کہ اس سارے ذخیرہ کو سامنے رکھکر اجتماعی طور سے اس کام کی طرف قدم بڑھایا جائے، ورنہ اگر یہ مسئلہ سیکولر مسلمانوں کی مدد سے حکومت کے ہاتھوں میں چلا گیا تو پھر اسلامی قوانین میں تبدیلی کا دروازہ کھل جائے گا، اور مسلمان زبانی احتجاج کے علاوہ کچھ نہ کرسکیں گے، اور اگر خود مسلمانوں نے اسکو حل کر دیا تو شاید حکومت کو مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئے،

ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(حصہ اول)

اس میں تاریخ کی مستند کتابوں سے عہد مغلیہ کے پہلے کے مسلمان حکمرانوں، مذہبی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کی ایسی سچی کہانیاں، قصے اور روایتیں اکھٹا کی گئی ہیں، جن سے سیاسی بصیرت کے ساتھ دینی حمیت، ایمانی غیرت، اخلاقی بلندی، باہمی رواداری، سپاہیانہ بہادری، اور سیرت و کردار کے پاکیزہ اور مطہر بنانے کا جذبہ دلوں میں پیدا ہو۔

مؤلفہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم، اے ۔ قیمت صر

تہذیب کی تشکیل جدید

معاشی نظام

از

مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۶)

شادی اور مجبوری کے وقت خادم

شادی و خادم کا ذکر بھی روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ثلاثۃ کلھم حق علی اللہ عونہ الغازی فی سبیل اللہ والمکاتب الذی یرید الاداء والناکح الذی یرید التعفف،[1]

تین قسم کے آدمیوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے، (۱) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، (۲) مکاتب جو کتابت کی رقم ادا کرنا چاہتا ہے، (۳) نکاح کرنے والا جس کا مقصد پاکیزہ زندگی گذارنا ہے،

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے یہ فرمان جاری کیا تھا،

ان انظر کل بکر لیس لہ مال ... دیکھو جو جوان شادی کرنا چاہے

---

[1] ابن ماجہ ابواب العتق باب المکاتب،

فشاء ان تزوجه فزوجه[48] — اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کی شادی کرا دو،

حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھ کر وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ دایاں ہاتھ جنگِ موتہ میں شہید ہو گیا ہے، یہ سُن کر آپ دیر تک روتے رہے، اور مختلف کاموں کے بارے میں پوچھتے رہے، کہ تمھارا یہ کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کو ایک خادم اور دوسری ضرورت کا سامان دینے کا حکم دیا،

فدعا له بخادم وامر له براحلة وطعام وما يصلحه وما ينبغي له[49] — ایک خادم دیا، سواری دینے کا حکم دیا، اور ضرورت کے دوسرے سامان دیئے،

غرض حکومت ایک خاص نظم کے تحت (جس سے غیر معتدل زندگی کو فروغ نہ ہو، اور جس کی شکل حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے) مذکورہ ضرورتوں کے انتظام کی ذمہ دار ہے خواہ یہ ضرورتیں خود فراہم کرے، یا رکاوٹیں دور کر کے آسانیاں فراہم کر دے،

وہ جس سے قوم خود کفیل ہو | (ب) معاشی لحاظ سے قوم کو خود کفیل بنانے کا ذکر درج ذیل قسم کی تصریحات میں ہے، قرآن حکیم میں ہے،

هو انشأكم من الارض واستعمركم فيها[50]، — اللہ نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، اور تم سے اس زمین میں آبادی کرائی،

ابوبکر جصاص کہتے ہیں:۔

[48] کتاب الاموال ص ۲۵۱، [49] کتاب الآثار باب فضائل الصحابہ حدیث ۸۵۲
[50] سعد، ہود، رکوع ۶،

فيه الدلالة على وجوب عمارة الارض للزراعة والغراس والابنية[51] — اس آیت میں دلالت ہے کہ کھیتی، باغبانی اور عمارتوں کے ذریعہ زمین کی آبادکاری واجب ہے،

قاضی بیضاوی نے خلافت کی بحث میں لکھا ہے،

وكذالك كل نبي استخلفهم في عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم[52]، — اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو زمین کی آبادکاری، لوگوں کی سیاست ان کے نفوس کی تکمیل اور اللہ کا حکم نافذ کرنے کے لئے اپنا خلیفہ بنایا ہے،

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

عمروا بلادي فعاش فيها عبادي[53]، — میرے ملک کو آباد کرو تاکہ میرے بندے اس میں خوشحال زندگی بسر کر سکیں،

ایک اور حدیث میں ہے،

اطلبوا الرزق في خبايا الارض[54]، — رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو،

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے،

مبت العجوه بين يدي — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

[51] احکام القرآن للجصاص ج ۲۔ ص ۱۶۵ [52] بیضاوی ص ۵۹ [53] و [54] المبسوط السرخسی ج ۲۳، ص ۱۵،

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	عجمیوں کو برا کہا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ
فنہی عن ذلک وقال لا تسبوھا	اُن کو بُرا نہ کہو انھوں نے اللہ
فانھا عمرت بلاد اللہ فعاش	کے ملک کو آباد کیا جس سے اللہ کے
فیھا عباد اللہ[۱]	بندوں نے خوشحال زندگی گذاری،

ماوردی نے حکومت کی ذمہ داری گناتے ہوئے لکھا ہے،

والثالث عمارۃ البلدان	تیسری یہ ہے کہ ذرائع نقل وحمل
باعتماد مصالحھا وتھذیب	شاہراہوں اور دوسری تمام مصلحتوں
سبلھا ومسالکھا،[۲]	(زمانہ کے مطابق) کی رعایت کے ساتھ
	ملک کو آباد وخوشحال رکھنا،

آمدی لکھتے ہیں:۔

ان مالا یتم الواجب الا بہ	جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ
واجب مثلہ،[۳]	ہو سکے، وہ بھی اسی طرح واجب ہوگی،

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

ومالا یتم الواجب الا بہ فھو	جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو، وہ
واجب،[۴]	بھی واجب ہے،

تنظیمات کے بارے میں حکومت کے اختیارات وسیع ہیں

مذکورہ دونوں قسم کے انتظام میں حکومت کو اختیار ہے کہ جدید تنظیم قائم کرے، یا موجودہ تنظیم سے کام چلائے، اپنی ماتحتی میں تنظیم قائم کرے

[۱] ادب الدین والدنیا ص ۲۰۸، [۲] الاحکام السلطانیۃ للماوردی [۳] اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۵۸، [۴] الجوامع فی السیاسات الالٰہیہ ص ۱۶،

یا لوگوں کو آزادانہ قائم کرنے کا حکم دے، لیکن بنیادی حیثیت سے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے،

تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو

(۱) تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو کہ اُس کے بغیر بقاء کا جواز نہ حاصل ہو سکے گا،

(۲) اس میں نفع ونقصان کا مدار اخلاقی ہو، اس کے بغیر مفاسد کا دروازہ نہ بند ہو سکے گا،

قرآن حکیم میں مقابلۃً مفید تر کا ثبوت درج ذیل ہے،

انّ اللہ یأمرُ بالعدل و	بے شک اللہ عدل واحسان کا
الاحسان،[۱]	حکم دیتا ہے،

عدل واحسان نہایت وسیع اور جامع لفظ ہیں، اُن کے ذریعہ مصالح کے حصول اور مضرت کے دفعیہ پر ابھارا گیا ہے جس سے حالات وزمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم کو اختیار کرنے کا ثبوت ملتا ہے،[۲]

دوسری جگہ ہے،

وما ارسلنٰک الا رحمۃً	اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کو محض اس لئے
للعٰلمین،[۳]	بھیجا کہ رحمتِ عامہ کا ظہور ہو،

"رحمتِ عامہ" میں حالات وزمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم بھی داخل ہے، کیونکہ اگر کسی ایک طریق کار پر اکتفا کیا گیا، تو لوگ تنگی میں مبتلا ہوں گے، جس سے رحمت کے منافی بات لازم آئے گی،[۴]

نفع ونقصان کا مدار اخلاقی ہو

قرآن حکیم میں نفع ونقصان کے مدار کا ثبوت یہ ہے،

[۱] سورۂ نحل رکوع ۱۳، [۲] تعلیل الاحکام ص ۲۰۷، [۳] سورہ انبیاء رکوع ۷، [۴] تعلیل الاحکام ص ۲۸۷،

یسئلونک عن الخمر والمیسر	لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں،
قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس	آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بڑا
واثمھما اکبر من نفعھما[1]،	گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے فائدے

کلام عرب میں "اثم" اخلاقی و روحانی نقصان اور ضرر، مادی وجسمانی نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے، اسی لئے آیت میں ضرر کے بجائے لفظ اثم لایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواز و عدم جواز یا حلال وحرام کے لئے مدار اخلاقی و روحانی نقصان ہے، نہ کہ مادی وجسمانی نقصان،

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ خود قرآن مجید میں ہے کہ انھوں نے قحط کے زمانہ میں غذائی اشیاء محفوظ کرکے بقدر ضرورت لوگوں میں تقسیم کرنے کا نظم قائم کیا تھا،[2] جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کو حالات کی رعایت سے مفید تر راہ اختیار کرنے کا حکم ہے،

حکومت کی ماتحتی میں تنظیم ہو | عہد نبوی میں اس کے لئے کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی، بلکہ جو آمدنی آتی تھی آپ اسکو اسی وقت مستحقین میں تقسیم فرما دیتے تھے، البتہ حضرت ابوہریرہؓ کو مامور کیا تھا کہ جو ننگا بھوکا مسلمان آتا، وہ اس کو آپ کی خدمت میں لے آتے، آپ اس کے کھانے پینے کا انتظام فرماتے،[3]

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں یہی طریقہ رکھا جو آمدنی ہوتی تھی، اس کو تقسیم فرما دیتے، چنانچہ پہلے سال کی آمدنی میں بلا تفریق مرد عورت، بوڑھے بچے، اور آزاد و غلام دس دس درہم تقسیم کئے، دوسرے سال کی آمدنی میں بیس بیس درہم، (طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۲)

[1] بقرہ۔ ۲۷، [2] یوسف [3] السنن الکبری کتاب الوکالۃ باب التوکیل فی المال وطلب الحقوق نیز التراتیب الادارایہ جلد ۲

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں باقاعدہ بیت المال قائم کیا، جس کے مصارف میں بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم سارے غربا و مساکین کی امداد و دستگیری بھی تھی، اس کی تفصیل حدیث و فقہ کی کتابوں میں ہے، آپ کا عام حکم تھا کہ

"مملکت میں ہر تنگدست کو دیا جائے، ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے، ہر کمزور کی مدد کی جائے، ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے، ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے، وغیرہ"[1]

حضرت معاویہؓ نے سرکاری سطح پر کفالت عامہ کے لئے افسر اعلیٰ کا تقرر کیا تھا،

فجعل معاویۃ رجلا علی	حضرت معاویہؓ نے لوگوں کی ضرورت
حوائج الناس[2]،	پر ایک آدمی مقرر کیا،

آزادانہ تنظیم ہو | آزاد تنظیم کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جاہلیت کی اس قسم کی آزاد تنظیم عاقلہ وغیرہ کو برقرار رکھا، اور عوام کو بھی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا، جس سے جدید تنظیم قائم کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

من کان معہ فضل ظھر	جس شخص کے پاس سواری، اور
فلیعد علی من لا ظھر لہ	دوسرے سامان ضرورت سے زائد
ومن کان لہ فضل من زاد	ہوں، وہ اس شخص کو دیدے، جس
فلیعد بہ علی من لا زاد لہٗ	کے پاس یہ سامان نہ ہوں جس کے

[1] شرع شرعۃ الاسلام سید علی زادہ، [2] ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء فی امام الرعیۃ،

قال فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رائینا انه لا حق لاحد منا فی فضل،

پاس کھانے پینے کی چیزیں ضرورت سے زائد ہوں، وہ زائد چیزیں مفلس ونادار کو دیدے، ابو سعید خدریؓ کا قول ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اسی طرح مال کی مختلف قسموں کا ذکر کرکے زائد مال دوسروں کو دینے کی تاکید فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ زائد مال میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا:-

ان اللہ تعالیٰ افرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر ما یکفی فقرائھم فان جاعوا او عروا وجھدوا فبمنع الاغنیاء حق علی اللہ ان یحاسبھم یوم القیمۃ و یعذبھم علیہ،

اللہ تعالیٰ نے بقدر کفایت غرباء کی ضرورت پوری کرنا مالداروں پر فرض کیا ہے اگر وہ بھوکے ننگے یا اور کسی معاشی مصیبت میں مبتلا ہوئے، تو یہ مالداروں کے نہ دینے کی وجہ سے ہے، اللہ کا حق ہے کہ قیامت کے دن ان سے حساب لے اور ان کو سزا دے،

یہ احکام عام ہیں ان میں انفرادی صدقہ وخیرات اور اس کی تنظیم دونوں شامل ہیں،

تشکیل میں انفرادی و اجتماعی ملکیت دونوں کی اجازت ہے

بدقسمتی سے اس زمانہ میں ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلۂ ملکیت کو دیدی گئی ہے، جس کے غلط تصور نے بڑے بڑے نتائج پیدا کیے، آج بھی اس کی وجہ سے بہت سے ملکوں میں ایک طبقہ میں محنت ومشقت کے بغیر دولت وسامان عیش کی انتہائی فراوانی ہے اور دوسرے طبقہ میں محنت ومشقت کے باوجود فلاکت ونکبت ہے، ایک طرف ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ہے، اور دوسری طرف ملک معمولی معمولی چیزوں میں دوسروں کا محتاج ہے، ایسی حالت میں تشکیل جدید میں نہ ملکیت کی بحث کی کوئی اہمیت ہوگی اور نہ تنظیم کو (انفرادی یا اجتماعی) میں محدود کرکے تنگی پیدا کی جائیگی بلکہ انفرادی واجتماعی دونوں کی اجازت ہوگی اور سردست حالات کے لحاظ سے ذرائع پیداوار درج ذیل حصوں میں تقسیم کردیے جائیں گے،

ذرائع پیداوار کی تقسیم

(۱) وہ جن پر اجتماعی ملکیت ہوگی یعنی حکومت براہ راست انتظام کریگی،

(۲) وہ جن پر بتدریج اجتماعی ملکیت ہوگی،

(۳) وہ جن پر انفرادی ملکیت ہوگی،

پہلے حصہ کی تفصیل

پہلے حصہ میں حکومت کی نامزد کردہ بنیادی صنعتیں اور اس قسم کی چیزیں شامل ہوں گی:-

(الف) فولاد و لوہا۔ اس میں کان کنی اوزار اور ڈھالنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں،

(ب) اسلحہ جات۔ اس میں دفاع سے متعلق صنعتیں ہیں،

(ج) برقی پلانٹ۔ اس میں بجلی پیدا کرنے کی طاقت اور اس سے متعلق صنعتیں ہیں،

(د) اٹامک انرجی (ایٹمی طاقت)

(س) کوئلہ کی کان۔ تارکول، پٹرول اور گیس کی صنعت

(ش) خام میگنیز

(ص) جواہرات، سونا، چاندی، تانبا، جستہ، سیسہ،

(ط) ہوائی، بحری اور ریلوے ٹرانسپورٹ

(ع) ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور وائرلیس

(ف) کپڑوں کے مل، بڑے کارخانے اور ڈاک خانے

دوسرے حصہ کی تفصیل

(۲) دوسرے حصہ میں مثلاً یہ چیزیں شامل ہوں گی

(الف) المونیم اور ٹین کی صنعت

(ب) کوئلہ سے کاربن بنانے کی صنعت

(ج) چھوٹے اوزار کے لیے چھوٹی مشینیں

(د) رنگ سازی و پلاسٹک کی چیزیں

(ر) انگریزی دوائیں اور جراثیم کش دوائیں

(س) روڈ ٹرانسپورٹ

(ص) سمنٹ کے کارخانے

(ط) کاغذ کے کارخانے

(ع) چائے کے باغات اور اس سے متعلق چیزیں

(ف) ان کے علاوہ اور چیزیں جو ان میں شامل ہونے کے لائق ہوں،

تیسرے حصہ کی تفصیل

(۳) تیسرے حصہ میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں اور گھریلو صنعتیں شامل ہیں

(الف) چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے نجی و عوامی کمیٹیاں قائم ہوں گی، ا

وہ انفرادی طور پر انجام پائیں گی، ان کے لیے قواعد وضوابط شریعت کی روشنی میں مقرر ہوں گے اور حکومت (بشرط مصلحت) ان کے لیے سرمایہ کی ایک حد (مثلاً دس بیس لاکھ وغیرہ) مقرر کرنے کی بھی مجاز ہوگی جس کے بعد وہ انفرادی سے نکل کر اجتماعی میں آسکتی ہیں،

(ب) گھریلو صنعتوں کے لیے سرمایہ کی حد بندی نہ ہوگی، ان میں گھر کے ہی اکثر افراد کام کرتے ہیں، باہر کے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے، اس بنا پر نہ کام کرنے کے اوقات کا تعین ہوتا ہے اور نہ کام کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے، حکومت چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لیے قرض دیگی اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کرے گی،

اس طرح ایک طرف اجتماعیت کا تجربہ ہوگا تو دوسری طرف افراد کو کاربار کا موقع ملتا رہے گا، ان میں نہ کوئی آخری شکل ہوگی، اور نہ کسی شکل کو ذاتی وقار واقتدار کے لیے باقی رکھا جائے گا کہ وہ سرچشمۂ رزق پر قابض ہو کر اللہ کی مخلوق کو غلامی پر مجبور کرسکے،

جدید تشکیل میں ملکیت کے صحیح تصور پر عمل درآمد ہوگا

تشکیل جدید میں انفرادی واجتماعی بحثوں کے بجائے ملکیت کے صحیح تصور پر عمل درآمد ہوگا اور تعلیم وتربیت پر زور دیا جائیگا،

صحیح تصور یہ ہے کہ ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان بحیثیت "امین" اس پر قابض ہے، یعنی ذرائع پیداوار افراد کے سپرد ہوں یا جماعتوں کے، ان سب کی حیثیت محض "امین" کی ہے، جس کو مالک کے مقررہ قانون کے مطابق استعمال وانتفاع کا حق حاصل ہے، اور اسی وقت تک یہ حق حاصل رہے گا جب تک وہ حصول مقصد (خلق خدا کی خوشحالی وفارغ البالی) میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ایسی فضا

پیدا کرنے میں مددگار بنیں، جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو،

تشکیل میں اسی حق استعمال و انتفاع کو حقِ ملکیت سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آراضی کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:

وحق الملك فی الآدمی انه احق بالانتفاع من غیره [۱]	حق ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے غیر کے مقابلہ میں زیادہ انتفاع کا حق حاصل ہو۔

اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں باہمی ربط پیدا کیا جائیگا

تعلیم و تربیت کے ذریعہ اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں ربط پیدا کیا جائے گا، اسکے بغیر مذکور تنظیمات سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، اگر محض تنظیمی تبدیلی کے ذریعہ معاشی مسائل حل بھی ہوگئے تو اخلاقی اصلاح نہ ہونے سے دوسرے بہت سے نفسیاتی و اجتماعی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے جن پر قابو پانا سخت مشکل ہوگا۔

مذکورہ بالا اشیاء کی فہرست نہ آخری ہے اور نہ کوئی فہرست آخری ہو سکتی ہے، حالات کے لحاظ سے حکومت کو نئی فہرست بنانے اور پرانی فہرست میں ردوبدل کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح چند معدنیات کو چھوڑ کر انفرادی کو اجتماعی اور اجتماعی کو انفرادی میں تبدیل کرنے کا بھی پورا اختیار ہے، البتہ حکومت وعوام دونوں کے ہر اقدام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور ضروری ہے، اور حقوق سے زیادہ فرائض پر زور ہوگا۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ

حافظ امان اللہ بنارسی

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

دہلی کو روانگی اور واپسی پر شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی سے بیعت و ارادت

سلطان عالمگیر کی حکومت کا پچاس سالہ دور (۱۰۶۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک) پورے ملک کے لیے امن و امان، عیش و رفاہیت کا دور تھا، خاص طور سے دیار پورب شاہی توجہات و عنایات سے ارباب علم و فضل کے حق میں گلزار تھا، اسی زمانہ میں حافظ صاحب نے نشو و نما پائی، خود ان کا گھر بھی گلزار بنا ہوا تھا، اس پر عالمگیر کی خصوصی توجہ تھی، مگر سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا انتشار پیدا ہوا کہ پورے ملک میں ابتری پھیل گئی، دیار پورب کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑنے لگیں، اور علماء و فضلاء اور مشائخ سکون و اطمینان کی نعمت سے محروم ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلنے پر مجبور ہوگئے، ۱۱۳۱ھ میں محمد شاہ بادشاہ ہوا، اسی سال اس نے محمد امین نیشاپوری (برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری) کو اودھ کا حاکم بنایا، جس نے یہاں آتے ہی ایک طوفان برپا کر دیا، قدیم خانقاہوں اور مدرسوں اور علماء و مشائخ کی جاگیریں ضبط کر لیں، ان کو طرح طرح سے پریشان کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور خانقاہیں اجڑنے لگیں اور علماء و مشائخ پریشان ہو کر ادھر ادھر کا رخ کرنے لگے، آزاد نے مآثر الکرام میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

تا حدود سنہ ۱۱۳۰ھ ہنگامۂ علم و علماء
دریں گل زمین گرمی داشت تا آنکہ
برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری
در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ
شد، و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد،
نیز شامل دار الخیور جونپور و بنارس
و غازیپور و کڑا مانک پور و کوڑہ جہان آباد
وغیرہ ضمیمۂ حکومت گردید، و وظائف
و سیور غالات خانوادہائے قدیم
جدید یکقلم ضبط شد، و کار شرفا و نجباء
بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش
مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ
در پیشۂ سپاہ گری انداخت و دور
تدریس و تحصیل بآں درجہ نماند
امدادے کہ از عہد قدیم معدن علم
و فضل بود یک قلم خراب افتاد،
و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر
برہم خورد، انا للہ و انا الیہ راجعون[1]

۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین میں علم و علماء کی
سرگرمی باقی رہی، یہانتک کہ محمد شاہ
کے آغاز جلوس میں برہان الملک
سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ
کا حاکم ہوا، اور صوبہ الہ آباد، جونپور،
بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور،
کوڑا جہان آباد وغیرہ کے شہروں
کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے جدید
و قدیم علمی اور دینی خانوادوں کے
وظائف یکقلم ضبط کر لیے جس سے شرفاء
و نجباء کو سخت پریشانی برداشت کرنی
پڑی اور معاش و معیشت کی پریشانی نے
وہاں کے لوگوں کو علم سے باز رکھ کر سپہ گری
کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اور پہلے
کی طرح درس و تدریس کا رواج باقی نہیں رہا جو
مدرسے قدیم زمانہ سے علم و فضل کے معدن
تھے یکقلم ویران ہو گئے اور ارباب کمال
کی اکثر انجمنیں برباد ہو گئیں۔

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲

جونپور، الہ آباد، غازیپور، کڑا مانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ کی طرح بنارس کے ارباب فضل و کمال بھی محمد امین نیشاپوری حاکم اودھ کے ظلم کا شکار ہو کر جاگیروں اور وظائف سے محروم ہو گئے، حافظ صاحب بھی اس کا نشانہ بنے، انکے خاندان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ ختم کر دی گئیں، اس لیے ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دہلی جانا پڑا، مگر یہ نہیں معلوم کہ دہلی میں ان کی شنوائی اور وظائف و جاگیر کی واپسی ہوئی یا نہیں ہوئی، البتہ واپسی پر الہ آباد میں حضرت شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل ہوا، جو اس دور فتن و پریشانی میں سکونِ قلب کا باعث بنا، مآثر الکرام میں مجمل طریقہ پر صرف اتنی تصریح ملتی ہے:

در آخر ایام حیات از شاہجہان آباد
وارد الہ آباد شد، و از خدمت والائے
شیخ محمد یحییٰ المدعو بہ شیخ خوب اللہ
قدس سرہ استفادہ طریقۂ انیقۂ نقشبندیہ
نمود و آں مشغولی ورزید[1]

حافظ صاحب اپنی زندگی کے آخر ایام میں
شاہجہان آباد (دہلی) سے الہ آباد وارد
ہوئے، اور شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شیخ
خوب اللہ قدس سرہ سے طریقہ نقشبندیہ
کا استفادہ کر کے اس میں مشغول ہو گئے۔

سلوک و معرفت کی راہ بڑی پُرسکون ہوتی ہے، اس راہ کے راہی غم زمانہ سے آزاد ہو کر عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر جہاں یہ چیز اشخاص و افراد کے حق میں نعمت ہے، اقوام و ملل کے لیے نہایت پُرخطر ہے، اگر پوری قوم اجتماعی طور سے اس راہ پر چل پڑے تو سکون کی تلاش تباہی کا ذریعہ بن جائے گی،

حافظ صاحب کا سفرِ دہلی انتقال سے دو تین سال پہلے ہوا تھا، اس کے بعد

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲

انھوں نے درس و تدریس سے علیحدہ ہو کر سلوک و معرفت کی راہ اختیار کرلی، غالباً دہلی میں ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے تعلیم و تدریس کے ہنگامہ سے علیحدگی اختیار کرکے روحانی سکون و اطمینان کی تکمیل مدت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ میں شمار ہونے لگے۔

شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا اصل نام محمد یحییٰ ہے، وہ شیخ محمد افضل الہ آبادی (م ۱۱۲۴ھ) کے برادر زادہ، داماد اور مرید و خلیفہ ہیں، اصل وطن سید پور ضلع غازیپور تھا، شاہ خوب اللہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے، علم شریعت و طریقت کے بحر زخار تھے، پوری عمر اپنے استاذ و مرشد کی تعلیم و تربیت کے مطابق بسر کی، رشد و ہدایت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ میں الہ آباد میں وفات پائی، حافظ صاحب نے دہلی سے واپسی پر ان سے بیعت کی اور طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق ریاضت کرکے چند ہی دنوں میں اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، اور زندگی کے باقی دو تین سال اسی روحانی سکون میں بسر کیے، ان کے روحانی ارتقاء میں خود ان کے خاندانی مذاق اور گھریلو تعلیم و تربیت کو بڑا دخل تھا، ان کے والد شیخ محمد رشید جونپوری اور ان کے بیٹے شیخ محمد ارشد جونپوری کے روحانی فیض سے "غلام درگہ پیران چشتی" تھے، اور مفتی و فقیہ اور قاضی کے لباس میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرتے تھے، حافظ صاحب اپنے والد کے روحانی فیض سے بہرہ یاب تھے لیکن انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ دینی علوم کی تعلیم اور علماء کے انداز پر گذارا، آخر میں اس بزم خشک میں شاہ خوب اللہ کی ایک نگاہ نے آگ لگادی۔

مرشد کی نگاہ اور مسترشد کی استعداد نے تھوڑے ہی دنوں میں نسبت نقشبندیہ کے مخصوص اثرات بہ کمال و تمام ظاہر ہوگئے، مآثر الکرام میں ہے:

بعد ظہور آثار معہود ایں طائفہ علیہ حضرت شیخ فرمودند کہ ظاہراً بعد اجتماع کہ سید سندرا با خواجہ علاء الدین عطار اعظم مرقدہ اتفاق افتادہ ایں قسم اجتماع نشدہ باشد ولکن شما از سید درین طریق راجح اید، و من در جنب خواجہ رتبہ ندارم

حافظ صاحب پر حضرات نقشبندیہ کے مخصوص اثر کے ظہور کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ سید سند اور خواجہ علاء الدین عطار کے باہمی اجتماع کے بعد بظاہر میرے تمھارے درمیان اس قسم کا یہ دوسرا اجتماع ہے مگر تم اس معاملہ میں سید سند سے سبقت لے گئے، اور خواجہ علاء الدین عطار کے مقابلہ میں کوئی مقام و رتبہ نہیں رکھتا،

یہ سنکر حافظ صاحب نے عرض کیا

حافظ امان اللہ تواضع کرد کہ شما قدم بقدم خواجہ اید و من با سید مساوے ندارم[1]

حضرت والا خواجہ علاء الدین کے ہم پلہ ہیں، البتہ میں سید سے کوئی نسبت نہیں رکھتا،

مرشد و مرید کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب اگرچہ اس بزم میں بہت دیر سے آئے مگر بہت جلد صف اول میں پہنچ گئے، اور شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ) کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی، جو ایک زمانہ میں زبردست ہنگامہ

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲

کا باعث تھا، اور جس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی تھیں، میر سید محمد ترمذی ۱۱۰۱ھ، شیخ محمد افضل الٰہ آبادی ۱۱۲۴ھ اور شیخ محمد بن عیسیٰ ہرگامی اکبرآبادی ۱۱۰۱ھ وغیرہ نے بھی اس کی شرحیں لکھیں، شیخ محب اللہ الٰہ آبادی مشاہیر علمائے صوفیہ میں ہیں، حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی کے خلیفہ تھے، فن تصوف میں ان کی تحقیقات وتدقیقات مرتبۂ اجتہاد کو پہنچی تھیں رجب ۱۰۵۸ھ میں الٰہ آباد میں فوت ہوئے، تصوف کے اسرار وحکم پر ان کی متعدد کتابیں ہیں، جن میں سے ایک رسالہ تسویہ بھی ہے، مولوی عبد الحی نے مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ رسالہ تسویہ میں علاوہ اور امور کے جبرئیل و وحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"جبریل محمد در ذات محمد بود صلی اللہ علیہ وسلم، وہمچنیں جبریل با ہر پیغمبرے در ذات وے بود، وآں قوت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت وحی بر ایشاں نازل می گردید، ولہذا جبریل با ہر پیغمبرے بزبان وے سخن گفتہ"[1]

اور آزاد نے میر سید محمد ترمذی کالپوی ۱۱۰۱ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے وار دات کے نام سے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی تھی، اس زمانہ کے علمائے ظاہر نے شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کے رسالہ تسویہ پر ہنگامہ برپا کر کے سلطان عالمگیر کو خبر پہنچائی کہ اس رسالہ میں شریعت کے خلاف باتیں ہیں، سلطان نے حکم دیا کہ پورے ملک کے درویش اور مشائخ کو معسکر سلطانی میں حاضر کر کے سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے، اس موقع پر شیخ محمد افضل الٰہ آبادی کو میر سید محمد ترمذی کی کتاب وار دات کے بارے میں تشویش ہوئی کہ غلبۂ حال میں یہ کتاب سپرد قلم ہوگئی ہے، اور رسالہ تسویہ کے بارے میں بہت

[1] مقدمہ مآثر الکرام

زیادہ اشتعال پھیلا ہوا ہے، اس لیے وار دات کو پانی میں ڈال دیا جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا، مگر کتاب محفوظ رہی، اور یہ نسخہ شیخ خوب اللہ (محمد یحییٰ) الٰہ آبادی کے پاس محفوظ رہا، آزاد نے لکھا ہے:-

شیخ محمد یحییٰ الٰہ آبادی قدس سرہ در کتاب اعلام الانام می گوید من ایں رسالہ بعینہا با رسائل دیگر از تصانیف حضرت سید میر قدس سرہ یکجا جلد کردہ حرز جان وایمان دارم"[1]

علمائے شریعت کی طرح سلطان عالمگیر نے اس رسالہ پر شدید نکیر کی اور صوفیہ ومشائخ کے محضر میں شیخ محب اللہ کے مریدوں سے کہا کہ اس رسالہ کے مندرجات کو احکام شریعت کے مطابق کر کے بتاؤ، ورنہ شیخ کی بیعت وارادت سے توبہ کرو،

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسویہ کس قدر مختلف فیہ رسالہ تھا، اور اس کے مباحث بظاہر فلسفیانہ افکار ونظریات پر مشتمل تھے، اس کی شرح کے لیے قلم اٹھانا اور اس کے معتویات کو شریعت کے مطابق ثابت کرنا باطنی اسرار وحکم کے ماہرین ہی کا کام ہو سکتا ہے، اس لیے حافظ صاحب کی شرح تسویہ علوم باطنی میں ان کے تبحر کی بین دلیل ہے۔

تصانیف حافظ صاحب علوم مروجہ وفنون متارفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی شغل رکھتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، تصوف، کلام اور فلسفہ وغیرہ پر ان کی متعدد ومعیاری کتابیں ہیں،

[1] مقدمہ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳،

(۱) المفسر اصول فقہ میں عربی زبان میں نہایت جامع متن ہے، (۲) المحکم رسالہ مفسر کی شرح ہے، محکم الاصول کا قلمی نسخہ حضرت مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارسی کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر اس کی موجودہ بے ترتیبی کی وجہ سے اس کی زیارت نہیں ہوسکی، (۳) شرح رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی، (۴) ملا محمود جونپوری اور میر باقر استرآبادی کے درمیان حدوث دھر کے مباحث پر محاکمہ، (۵) حاشیہ تفسیر بیضاوی، (۶) حاشیہ حکمۃ العین، (۷) حاشیہ عضدی، (۸) حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ (۹) حاشیہ تلویح، (۱۰) حاشیہ شرح مواقف (۱۱) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۲) حاشیہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جونپوری، اس میں جابجا ابحاث باقیہ کا رد بھی ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید جونپوری کے استاد ملا محمد افضل استاد الملک نے ایک مرتبہ رسالہ شریفیہ کی تعریف کی، شیخ محمد رشید نے ان کے ہاتھ سے لیکر آٹھ دن میں اس کی بہترین شرح لکھ دی جس سے ملا محمد افضل بہت خوش ہوئے، اس سے ملا محمود کو انقباض ہوا، اور انھوں نے اپنے ایک شاگرد ملا محمد باقی کو حکم دیا کہ تم رسالہ شریفیہ کی شرح لکھو، جس میں شیخ محمد رشید کی شرح کی بھی شرح ہو، چنانچہ ملا محمد باقی نے چند دن میں شریفیہ کی شرح آداب باقیہ کے نام سے لکھکر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کردی اور اسی کے ساتھ شیخ محمد رشید کی شرح کی ایک شرح ابحاث باقیہ کے نام سے لکھی، جس میں جگہ جگہ شیخ محمد رشید پر اعتراضات کیے، حافظ صاحب نے شیخ محمد رشید کی فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کی شرح میں ملا محمد باقی کی کتاب ابحاث باقیہ کے ان ہی اعتراضات کا رد کیا ہے،[1] افسوس ہے کہ حافظ صاحب کی ان تصانیف میں

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۶،

کوئی کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذر سکی کہ اس کا تفصیلی تعارف کرایا جاسکے، انکی سب سے آخری تصنیف شرح تسویہ ہے،

وفات شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت کے بعد دو تین سال تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کرکے ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں فوت ہوئے، آثر الکرام میں ہے

عنقریب ہماں ایام در بنارس کہ	قریب قریب ان ہی ایام میں اپنی
مسقط الراس او ست انتقال کرد،	جائے پیدائش بنارس میں ۱۱۳۳ھ
وکان ذلک فی سنۃ ثلث وثلثین	میں فوت ہوئے، اور اسی جگہ
ومائۃ والف، وہمانجا مدفون گردید[1]	دفن کیے گئے،

تمام تذکرہ نویسوں نے حافظ صاحب کا سنہ وفات اور مدفن یہی بتایا ہے، لیکن کسی میں مہینہ اور تاریخ کی صراحت نہیں ہے، اسی روضہ میں ان کا بھی مزار ہے جسے انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں اپنے والد وغیرہ کے لیے تعمیر کرایا تھا، جو اس وقت علوی پورہ میں سٹی اسٹیشن کے جنوب میں سڑک کے اس پار واقع ہے، اسی کے پاس یتیم خانہ مظہر العلوم کی عمارت ہے، مقبرہ کے کتبہ میں یہ اشعار ہیں، جو حافظ امان اللہ بنارسی کے والد مفتی نور اللہ کے بارے میں ہیں، ان کے مادۂ تاریخ سے ۱۱۰۴ھ نکلتا ہے:۔

نماند کسے دائم اندر جہاں	ندارد بنا گنبد آسماں
بلغلطند زیر زمیں مہوشاں	بخاک اندر آمیز کیخسرواں
گدا و شہ و قانع تاجراں	گذشتند چوں برق در یک زماں

[1] آثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳

بسا بادشاہ و سکندر نشاں | نشاں نش نماند دریں کارواں

درحقیقت دل است روضۂ دوست

ہر کہ صافش گرفت دوست از اوست

دریں دہر ہر کس کہ آمد دراں | بدنیا کجا یافت آرام جاں
چہ شد اں سلیمان و نوشیرواں | چہ جمشید در آخر گلستاں
نہ آں شہ سواران لشکر کشاں | نہ آثار ترکش، نہ تیر و کماں

روضۂ چشم کن صفا اے دوست

اوست دہر مقام خلق از وست

کجا خاک و کوباد، و آب رواں | کجا آتش گرمئ دیگراں
نہ افلاک پائندہ و سائباں | مگر ذات حق "کل یوم بشاں"

صاف کن روضۂ دل خود دوست

صوفی ز روضۂ دل خود اوست

بنا کرد حافظ دریں بوستاں | ز بہر خدا مرقد دوستاں
مورخ ز امداد غیب اللساں | بگو یافتہ "روضۂ طالباں"
سنہ ۱۱۷۲ھ

چشم بکشا در آب روضۂ دوست

ہرچہ بینی بداں کہ مظہر اوست ہے۔

ان اشعار میں جگہ جگہ فنی اور شعری استقام ہیں جو انکے صحیح طور سے پڑھ نہ جانے کا نتیجہ ہیں۔

برہان الملک سعادت خاں کے پرآشوب دور میں آپ کا خاندان محفوظ رہا مگر بعد میں نوابان اودھ کی کوشش سے دوسرے سنی خاندانوں کی طرح آپکے خاندان کے افراد بھی شیعہ ہوگئے۔

برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال

از
جناب لطف الرحمٰن صاحب پٹنہ

یہ امر مسلّم ہے کہ زبان جب تک زندہ رہتی ہے دوسری زبانوں سے اثر قبول کرتی رہتی ہے، ان کے الفاظ اس زبان کے اپنے الفاظ بنجاتے ہیں، دنیا کی تقریباً سبھی زندہ زبانوں میں یہ اصول پایا جاتا ہے۔ اگر انگریزی زبان سے فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور اردو سے فارسی، عربی اور ترکی الفاظ خارج کر دیے جائیں تو یہ زبانیں بے مایہ ہوکر رہ جائینگی۔

اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دو مختلف زبانیں بولنے والی قومیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد قائم ہوتا ہے تو قانون فطرت کے مطابق مذہب، اخلاق، زبان اور طرز رہائش وغیرہ پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے، جو رفتہ رفتہ زیادہ واضح اور نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے، پوری دنیائے لسانیات میں یہ اصول کارفرما ہے، اور دنیا کی تقریباً سبھی زبانیں اسی اشتراک و اتحاد کی رہین منت ہیں، اس میں کوئی استثنا نہیں کیونکہ اظہار مطلب اور افہام و تفہیم کے لیے ہر شخص ایسا لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کو دوسری قوم کا فرد سمجھ لے، یہ سلسلہ

برابر چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں،

برج بھاشا، شورسنی اپ بھرنش کی ایک شاخ ہے، اپ بھرنش کا زمانہ پراکرت کے بعد کا ہے۔ پراکرت کے انحطاط کے بعد مختلف علاقوں میں جو مختلف اپ بھرنشیں ابھریں اُن میں شورسنی اپ بھرنش اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس عہد میں ادب کے وجود کا سراغ اسی زبان میں ملتا ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے :-

"Possibly Soursení was the polite language of the day when people employed a vernacular, and in the Apaleransa period, eastern poet employed the Sourseni - Apaleransa to the exclusion of their local pation (The origin & The Devlopment of Bengali Lang) P. 91

اور ڈاکٹر ہنپتی آریانی اپنے ڈی۔ لٹ کے مقالے میں فرماتی ہیں :-

"اشوک کے بعد کے ایتہاس (تواریخ) سے گیات (معلوم) ہوتا ہے کہ اشوک کے بعد ماگدھی کے وکاس (فروغ) پر دھیان نہیں دیا گیا۔ اس کا ویوہار (استعمال) بن سرپنی (بچلے طبقے) کے لوگ کرنے لگے .... ودوانوں (علما) کا انومان (اندازہ) ہے کہ اکیلے شورسنی اپ بھرنش نے ہی ماگدھی اور اردھ ماگدھی بھاشاؤں کا سنہا ہنک چھیر

۱؎ محمد یحییٰ تنہا ۔ سیر المصنفین جلد اول ص ۳۵

(ادبی علاقہ) ادھیکرت (محفوظ) کرلیا، اس انومان کا آدھار یہ ہے کہ کیول شورسینی اپ بھرنش میں ہی ساہتیہ الیبدھ ہوتا ہے، اس تھیہ (حقیقت) کی پشٹی (تصدیق) اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اپ بھرنش کال میں پوربی چھیتروں کے کوی اپنی چھیتر کی بولیوں (علاقائی زبانوں) اُپیکچھا (نظر انداز) کرکے شورسینی اپ بھرنش کا ویوہار ساہتک ادیشیوں کیلئے کرتے تھے۔" (مگھی بھاشا کا ادھین)

مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور یہاں باضابطہ توطن اختیار کیا تو ہندوستان کے باشندے ان کی زبان و تہذیب اور اخلاق و عادات سے قدرتاً متاثر ہوئے، مسلمان اپنے ساتھ ایک اعلیٰ مذہب، ایک مکمل دین اور بلند اخلاق لے کر آئے تھے، اخوت و مساوات کے معلم تھے اور کمزوروں سے ہمدردی، عورتوں پر رحم، عبادت خانوں کا تحفظ دینی فرض سمجھتے تھے، اس کے برعکس ہندوستان اونچ نیچ کی تفریق، اور برہمن اور شودر کے اختلاف میں مبتلا تھا، ان حالات میں یہاں کے باشندوں کے لیے اسلام کی تعلیمات عجیب اور قابل تقلید تھیں، چنانچہ دونوں قومیں پہلے سندھ اور اس کے نواح میں، پھر پنجاب، دلی، دکن، بہار اور بنگال میں ملیں اور صدیوں تک یہ ارتباط قائم رہا، اس ارتباط سے دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا، اس کی جھلک دونوں قوموں کی زبان میں بھی نظر آتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں بولی جانے والی تقریباً سبھی زبانوں مثلاً برج، کھڑی بولی، بندیلی، ہریانی، پنجابی، قنوجی وغیرہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں،

ہمارا موضوع فقط برج بھاشا میں عربی، فارسی کے استعمال کا جائزہ ہے،

برج بھاشا کا مرکز برج کا علاقہ ہے، اس میں متھرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے،

اس کا تعلق اردو زبان سے خاصا گہرا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اردو اسی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے[1] خیال میں برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے اطراف میں بولی جاتی ہے، بہت مشابہت رکھتی ہے، مگر یہ اپ بھرنش کی ایک علاحدہ شاخ ہے،

پروفیسر محمود شیرانی فرماتے ہیں :-

"ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں، لیکن جب ان دونوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے، اس لیے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں، ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں، بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔"

(پنجاب میں اردو مقدمہ)

برج بھاشا کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کے شعراء نے اپنے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے، برج کے مشہور شعراء میں سورداس، کونبھن داس، پرمانند داس، چتر بھج داس اور میرا بائی وغیرہ نے عربی، فارسی کے الفاظ نہ صرف استعمال کیے ہیں بلکہ حتی الوسع صحت کا بھی خیال رکھا ہے، خصوصاً سورداس نے اس کثرت اور مہارت کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کو عربی سے واقفیت تھی، اس میں حیرت کی کوئی بات

[1] سکینہ: تاریخ ادب اردو ص ۲۶

نہیں ہے، کیونکہ نابغہ فن تعصب و تنگ نظری سے پاک ہوتا ہے، پھر اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ فارسی دفتر کی زبان تھی، اس لیے ایک زندہ زبان ہونے کی حیثیت سے برج نے عربی فارسی کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹا، اس کی تصدیق ڈاکٹر پی۔ ان۔ منڈل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"......عربی، فارسی اور ترکی کے انیک شبد (متعدد الفاظ) اتری بھارت میں سامانیہ بول چال کی بھاشا میں پرچلت (مروج) ہو گئے تھے، یہی کارن ہے کہ ان بدیشی بھاشاؤں کا ودھی وت ادھین (باضابطہ مطالعہ) نہ کرنے والے کویوں نے بھی ان کا سوتنترتا پوروک (آزادانہ) پریوگ کیا، اور اس پرکار اپنی بھاشا کو ویوہارک روپ دینے میں سمرتھ ہو سکے۔" (سور کی بھاشا)

ذیل میں ہم برج بھاشا کے چند مشہور شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں:

سورداس :- فارسی اور عربی الفاظ کو اپنی شاعری میں جس کثرت سے اور جس خوبصورتی کے ساتھ سورداس نے استعمال کیا ہے، برج کے کسی شاعر نے نہیں کیا ہے، سورداس، کرشن بھگت اپنے زمانے کے عدیم المثال شاعر اور بڑے اچھے زبان داں تھے، ان کی زبان دانی کا اعتراف ہندی ادب کے تقریباً سبھی نقادوں نے کیا ہے، اور بحیثیت ماہر السنہ ان کی اہمیت تسلیم کی ہے، ذیل میں ان کے کلام کے حوالے سے ان الفاظ کی ایک مختصر فہرست نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے جسے سور نے استعمال کیا ہے :-

عربی الفاظ | عبیر - اُڑت گلال عبیر زدرتہ و وت دیپ اجیارو

عمل۔ آنند کند چند مکھ نسی دن او لوکت پہ عمل پریو

امین۔ نین این ادھر منی کیں بس چنہ کو تنہہ چھیو

اصل۔ کری اور جا پریم پرتی کو اصل کہاں کھتیاوے

قلعی۔ دیکھے مادھو کی چتورائی اودھری کنک قلعی دینچ گئے ٹھک

جمع۔ سابق جمع ہوتی جو جوری من ذالک تلیایو

جواب۔ سور آپ گذران مصاحب لے جواب پہنچاوے

مصاحب۔ ،، ایضاً ،،

عقل۔ اندر ڈھیٹ بلی کھائی ہمری دیکھو عقل گنوائی،

خطا۔ سورداس جمن کی بلی بلی کون خطائیں کر پابساری

فارسی الفاظ | ترکش، کمان۔ کربدھی کمان چڑھائی کوپ کری بدھی ترکش ریتا

گمان۔ بھری گمان دیلو کیتی ٹھاڑی اپنے رنگ رنگیلی

در۔ جیوت جاچت کن کن نردھن در در رٹت بے حال

دربار۔ جانت پانت (ذات پات) کو و پوچھت ناہیں سری پتی کے دربار

دستک۔ سورداس کی یہی ونتی دستک کی جے معاف

دامن گیر۔ ان پاپن تیں کیوں اب روگے دامن گیر تمہارے

سردار۔ تم تو بڑے کل جنئے ار و سب کے سردار

یہاں سورداس کا ایک دوہا نقل کیا جاتا ہے، جس میں انھوں نے بڑے سلیقے سے عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے:-

سانچو سو لکھنہار کہاویں

کایا گرام مساحت کری کے جمع باندھی ٹھہراوے

من مہتو کری قید اپن میں گیان جتیا لاوے

انڑی مانڑی کھر بیان کر و دہ کو باتا بھجن بھراوے

بٹہ کائی قصور بھرم کو فرد تلے گے ڈارے

نبچے ایک اصل پر راکھے ٹرے نہ کبھو ٹارے

کری اور جا پریم پرتی کو اصل کہاں کھتیاوے

دوجے قرض دور کری دیتہ نیکو نہ تامے آوے

مجمل جورے خرچ نی کے کری راکھے لیکھا سمو جھی بتاوے

سور آپ گذران مصاحب لے جواب پہنچاوے

اس کے علاوہ دربان، خاک، آواز، جہاز، سرتاج، باز، نقیب، خواص نوبت، ضمانت، نفع، شہنائی، پیادہ، دغا، بخشش، خراو، ریشم، غور، لایق حضور، بازار، ہزار، ثابت، صندوق، نیزہ، آخر، محل، فوج، ساز، خبر، زہر، گنہگار، طاق، وغیرہ الفاظ بھی سور کے یہاں ملتے ہیں،

سورداس کی حیثیت اپنے عہد کے نمائندہ شاعر کی ہے، اس لیے حوالے تفصیل سے پیش کیے گئے، سور کے بعد کو مبھن داس کا نام آتا ہے، جو اشٹ چھاپ شاعروں میں ہیں، انھیں بھی کرشن سے بڑی عقیدت تھی، انھوں نے اپنے دوہوں میں اس عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے دوہوں میں گذر، بسر، اوقات، گمان، دربار، ناز، نیاز خواص، باقی، جمع، صاف، معاف وغیرہ الفاظ ملتے ہیں، لیکن سور کے مقابلے میں اس طرح کے الفاظ بہت کم ہیں کو مبھن داس کے ہم عصر اور ہم عقیدہ چترپھج داس اور

پرمانند داس تھے، انھوں نے جہاں کرشن سے اظہار عقیدت کیا ہے وہاں شاعری کے دامن کو بھی وسیع کیا ہے، اگر برج کے شاعروں کی فہرست سے ان شعرا کو خارج کر دیا جائے تو اس کے ادب کی تاریخ نامکمل رہ جائیگی، انھوں نے احوال، اعلان، جاسوس، زر، ہزار، کاغذ، صاف، دربار، مقتول، کلمہ، قصیدہ، لائق، نہال، پرد، ریختہ، حیف وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں، سورداس کے بعد عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا سلیقہ سب سے زیادہ پرمانند داس کے یہاں نظر آتا ہے۔

برج کا علاقہ متھرا اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ راجستھان جیسے دور افتادہ خطہ کی باشندہ شاہی گھرانے کی خاتون میرا بائی نے کرشن جی سے اپنی محبت وعقیدت اور جوش جنوں کا اظہار اسی زبان (برج) میں کیا ہے، تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ میرا صغر سنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی، شوہر سوگ اور برہ کی آگ بجھانے کے لیے اس نے اپنی توجہ کرشن کی طرف منعطف کر دی تھی، اس کے یہاں بھی عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، بعض اشعار کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ کے ہیں، مثلاً

جو میں ایسا جانتی رے پریت کیے دکھ ہوئے　　نگر ڈھنڈھورا پیٹتی رے پریت نہ کریو کوئے

کہتے ہیں کہ میرا کا سادھو سنتوں میں بیٹھنا اور انکے ساتھ بھجن کیرتن کرنا میرا کے دیور رانا بکرماجیت کو پسند نہیں آیا، اسلیے اس نے زہر دینے کی کوشش کی، میرا نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے ؎

؎ زہر پیالہ بھیجیا رے دو بھیو میرا ہاتھ
؎ میرا کے پربھو گردھر ناگر ہنسکر پی گئی زہر

میرا کے یہاں نہایت روانی سے عربی فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے،

او ن کہہ گئے اجہوں نہ آئے دوس رہ اب تھوڑا　　میرا کے پربھو کب رو ملو گے عرض کروں کر جوڑا

۱؎ راجستھان کی پنگل بھاشا ۔ موتی لال۔

کلیاتِ علی

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی

علی قلی بیگ ترکمان ابن سلطان خلیفہ فارس کے ترکوں میں تھے، جہانگیر[۱] کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت میں منسلک ہو گئے، مؤلف عرفات عاشقین کے زمانہ میں ان کی شان وشوکت کا شباب تھا، برہان پور میں مقیم تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد معتوب ہو گئے، اور امارت اور درباری زندگی چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی اور فقراء کی صحبت میں رہنے لگے،

ان کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، ان کے یہ چند اشعار کئی تذکروں نے نقل کیے ہیں:-

طبع تو گر کامل افتادہ است جرم بادہ چیست　　برگلوی شیشہ نتوان بست تقصیر ترا
بسیار ملولیم ازیں عمر ندانیم　　کاسایش ما در دم تیغ کہ نہفتہ است
خیال شمع رویش دشمن آسایش من شد　　چراغے در نظر دارم ازاں خوابم نمی آید

کلیات علی کا ایک عمدہ قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے[۲]، سید مظفر نامی نے اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے کہ مصنف کی فرمایش سے لکھا گیا ہے، بعد ختم کتابت مصنف نے مضامین میں جو اضافہ کیا ہے، ان کو حواشی پر اپنے قلم سے لکھا ہے، اس میں

۱؎ ۱۰۱۴ھ ۔ ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۰۵ء ۔ ۱۶۲۷ء　　۲؎ ۱۸۱، ادب، نظم فارسی

پانچ لوحیں مذہب زبرجد کی ہیں۔

کلیات علی کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ مؤلف کے تجربات کا نچوڑ ہے، اور اس میں بے شمار حکایتیں ہیں، جن کا تعلق خود علی قلی سے تھا یا ان کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے اس زمانہ کی اخلاقی، معاشی اور سماجی حالت کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور ان میں ایران و ہند کی مشترک ثقافت کے گہرے نقوش دکھائی دیتے ہیں، ان حکایتوں سے خود مؤلف کے رجحانات اور تجربات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس نسخہ میں سب سے پہلے نثر میں ایک مقدمہ ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"نیست بر معنی وحدت شاہد، انما اللہ الہ واحد، در دار الشفا شرح شریف این بیمار نحیف علی گوید کہ نا ملایمات دنیوی و فکر احوال اخروی ......
این دیوانۂ الٰہی را چون بر دل ہجوم می کرد..... و زبان پریشان می گفت
دبر سرچہار سوق عالم کہ ہر کس بکیفیتی سرخوش بود و از شدت مستی پروای درد کسی نمی کرد...... غمی کہ ہست غم فرداست ......"

اس کے بعد مثنوی "بقعۃ العارفین"[1] ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

ذاں پیش کہ این نمود بی بود — از خلوت بود روی بنمود

اس کے بعد ایک دوست کا ذکر ہے، جس نے انھیں شعر کہنے سے منع کیا تھا۔

از گفتن شعر خود چہ حاصل — رعنائی طبع را فروہل

اس کے بعد "علمای قال" کے سلسلہ میں ہندوستان کی ایک رات کا ذکر

[1] ۵۶۰ بیت

کیا ہے، جس میں دان اول، دوم، سوم، اشراف، متکلم اور حکیم نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، پھر اپنے والد کی مدح کی

در گوشۂ این خرابہ خوارم — یکتا پدر است غمگسارم

اور ان سے اجازت لے کر سفر شروع کیا،

اس مقام پر علی نے اہل مدرسہ و صومعہ کی توصیف کی ہے اور "عالم قال" کو چھوڑ کر "عالم حال" اور توحید کی طرف رجوع کیا ہے، اس کے بعد ملا محمد صوفی مازندرانی[1] کا بڑے خلوص سے ذکر کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انکے بڑے گہرے دوست تھے،

یاریست مرا بکشور ہند — صوفی و ندیم و زاہد و رند

صوفی منشی محمد شش نام — خود باغ و بہار بادۂ و جام

صابر عراقی[2]، ابراہیم خاکی، ناوم جیلانی[3]، صدر الدین مسیحی، طالب عراقی کے ذکر پر یہ مثنوی ختم ہوتی ہے۔

دوسری مثنوی "خرقۂ علی"[4] ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

خدایا توئی بر جہاں بادشا — بزیرندۂ مردم پارسا

اس مثنوی کے شروع میں اس کا سبب تالیف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک سرد رات میں علی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوان نے آکر کہا کہ خرقہ تیار کرو، اس کے بعد شاہ عباس ماحی[5] کی مدح کی ہے:

[1] وفات ۱۰۳۵ھ/۲۶-۱۶۲۵ء [2] میر صابر متوفی ۱۰۷۰ھ/۶۰-۱۶۵۹ء [3] شہسوار بیگ نام گیلانی متوفی ۱۱۰۰ھ/۸۹-۱۶۸۸ء [4] تقریباً ۹۵۲ بیت [5] ۹۸۵ھ-۱۰۳۸ھ/۱۵۸۷-۱۶۲۹ء

خدیو خرد مند عباس شاہ — فروزندۂ بخت و تخت و کلاہ

مثنوی میں چار باب اور بہت سی چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں، جن میں سے اکثر آپ بیتی یا
یا شاعر کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی کتنے بڑے سیاح
اور تجربہ کار تھے، پہلے باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مثنوی ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں
ہندوستان میں لکھی گئی، اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی، اس میں شاعر نے اپنے
وطن واپس جانے کا بھی ذکر کیا ہے:-

شبی سر فرو بردہ بودم بجویش — بیاد آمدم عہد یاران خویش
بسیج سفر راہمی ساختم — دو اسپہ بدیں شوق می تاختم
ز ہجرت فزوں بودہ برہزار — کہ گشتم فلک وار ہر دیار
ہمانا کہ بودم ہمی سال سی — نوشتم بہند اینچنیں فارسی

بادشاہوں کی عدالت کے بارہ میں ایک حکایت سید خواجہ کی ہے جو کسی ہندی
راجہ کے پاس بہت دنوں تک رہے تھے، ایک قصہ خود علی کی جوانی کا ہے، وہ کسی کے
عشق میں گرفتار ہو گئے تھے، جب بادشاہ نے اس حسین کی شہرت سنی تو اس کو بلایا،
پھر جب علی معشوق سے ملے تو اس نے کہا "اے علی تم نے ابھی تک وہ جہانسوز حسین
نہیں دیکھا ہے جس کی آگ میں رند اور بادشاہ دونوں جل جاتے ہیں"

بگفتا علی سخت سوزیدۂ — تو حسن جہاں سوز نادیدۂ
سر کوئی خوباں ہمہ روزگار — ز شاہان و رنداں بود فتنہ تار

درویشوں کے اخلاق کے بارہ میں بہت سی دلچسپ اور مفید حکایتیں ہیں،
آخر میں ساقی نامہ کے طرز پر ایک حکایت ہے جس میں ایک گرم رات کا

نقشہ کھینچا گیا ہے،
"خزینۂ علی" کو علی نے نثر میں بھی لکھا ہے، اور اس کا نام "کتاب منثورۂ خزینۂ علی"
رکھا ہے، اس میں بادشاہوں کی سیرت کے بہت سے واقعات ہیں جو خود علی سے
متعلق ہیں، یا ان کے مشاہدہ میں آئے ہیں،
اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی[1] ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے،

بگذر از شاہدان عہد حکیم — انّ ربّی بکیدہن علیم

آخر میں ۲۵۲ رباعیاں ہیں، ایک رباعی میں اخوندوں کا مذاق اڑایا گیا ہے

اخوند کہ صوفی و متیں آمدہ است — بانشا تر پاک حزیں آمدہ است
یک بین و موحد ست در کردۂ خویش — در عیب کساں دل دو بین آمدہ است

ایک میں علی نے اپنے وطن جانے کا ذکر کیا ہے:-

آں دوست کہ در جوہرہا ساخت عرض — صحت ہمہ از و بود اگر اوست مرض
رو نہ بوطن علی بغربت تاکی — ہرنامہ کہ خواندیم ہمیں بود غرض

ایک رباعی میں علی لوگوں کی مذہبی تنگ ذہنیتوں کا ذکر کرتے ہیں، جس سے
ان کی وسعت مشرب کا پتہ چلتا ہے،

تاچند کہ ایں برافضی گشت شبیہ — تاکی کہ فلاں بناصبی ہست کریہ
زیں کعبہ رواں کنارہ خواہ علی — بتخانۂ ما ایں بتان است وجیہ

ایک رباعی میں کسی سورت کے بزرگ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

ار بندر سورت از تو معنی کدۂ — ہر دم علی از نگاہت اندر بدۂ
در آتش و آب در گرفتی عالم — تا در تر و خشک آتش اندر زدۂ

[1] سورت

ماخذ

۱۔ تقی اوحدی : عرفات عاشقین ، نسخۂ خطی شمارہ ۲۳۰ ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۲۔ والہ داغستانی :۔ ریاض الشعرا ، نسخۂ خطی شمارہ ۲۲۳ ب ، " "
۳۔ سراج الدین علی خاں آرزو :۔ مجمع النفائس ، نسخۂ خطی ، شمارہ ۶۹۵ " " "
۴۔ حسین قلی خاں عظیم آبادی :۔ نشتر عشق ، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۶ " " "
۵۔ سید علی حسن خاں : صبح گلشن ، مطبع فیض شاہجہانی ، بھوپال
۶۔ محمد عبد الغنی خاں : تذکرۃ الشعرا ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، علی گڑھ ۱۹۱۶ء
۷۔ علی قلی : کلیات علی قلی ، نسخۂ خطی شمارہ ۷۸۱ ، (نظم فارسی) سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
۸۔ احمد علی ہاشمی : مخزن الغرائب ، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳ ، خدا بخش لائبریری پٹنہ

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۶)

مباحث منطق ، حکمت و فلسفہ

عبد السلام ندوی ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۱ء

"مسئلہ ارتقا اور حکمائے اسلام" حوالہ ۲۷۹/۸

متکلمین اسلام نے جب علم کلام کو مدون کرنا چاہا تو ان کو دو مرحلے طے کرنا تھے ، اولاً تو یہ کہ خود یونانی فلسفہ سے صحیح واقفیت حاصل کی جائے اور اس کے بعد ان کی تردید کی جائے ، پہلا کام دوسرے کام سے مقدم تھا ، اس بنا پر علماء نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی ...

... ہیں جو لوگ قدیم فلسفہ میں اچور ہیں اُن کے نزدیک ڈارون کی وقعت ایک بندر نچانے والے سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس مسئلہ کا وہ موجد ہے اس سے زیادہ کوئی مسئلہ فلسفہ کی تمام عظیم الشان شاخوں کا جامع نہیں ،

عبد الکریم میر علوی اگست ، ستمبر ، اکتوبر ، نومبر ۱۹۱۲ء

حرکت زمین پر بسیط بحث حوالہ ۲۷۹/۹

اس رسالہ کے لکھنے سے بڑی غرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو ایک دنیا کی دنیا لڑ رہی ہے، جو کچھ فریقین نے اپنے خیالات ثابت کرنے کے لئے موشگافی کی ہے، سب کو سامنے رکھ دیا جائے، تاکہ لوگ خود فیصلہ کر سکیں،

اس رسالہ کے دیکھنے سے انگریزی داں۔ عربی والوں کے خیالات مع دلائل کے واقف ہو سکتے ہیں، اور عربی داں انگریزی دانوں کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں

عبدالواحد صاحب — جون سنہ ۱۹۱۱ء

امکان خلاء — ص ۲ . ۱۵

حوالہ ـ ۲۷۹/۸

"فلسفہ کے حاملانِ قدیم و جدید بالاتفاق یہ مانتے ہیں، کہ حقیقتِ اشیاء کا دریافت کرنا، انسانی طاقت سے بالاتر ہے، فلسفۂ قدیم کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ حقائقِ اشیاء کا علم محال ہے،

موضوع پر قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے،

علوی، ضیاء الحسن — اگست سنہ ۱۹۰۸ء

"حواس خمسۂ باطنی" — ص - ۵ - ۱۳

حوالہ ۲۷۹/۵

یونان کے کسی حکیم نے حواس خمسۂ ظاہری پر قیاس کر کے یہ تھیوری "قائم کی کہ انسان کے جس طرح یہ ظاہری پانچ حواس ہیں، اسی طرح پانچ حواس باطنی بھی ہیں، ... اس مسئلہ کے ماننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، سب سے پہلی آواز جو مسئلہ کی مخالفت میں اٹھی وہ متکلمین اسلام کی تھی"

علوی، ضیاء الحسن — جنوری سنہ ۱۹۰۷ء

حدوث مادہ — ص - ۲۱ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۳

"یہ مسئلہ کہ مادہ کو فنا نہیں، اور مادہ ہی ہر شے کی علت ہے، جب سے تاریخ فلسفہ کا ہم کو علم ہوا ہے، ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں مانا گیا ہے، اور اس مذہب کے موید ین ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں، لیکن مادہ کا جس قدر زور و شور ہمارے زمانہ میں ہے ویسا کبھی نہیں ہوا، چونکہ اس مسئلہ کا ایک پہلو اسلام کے مخالف ہے، لہٰذا ہم نے مادہ کے بقا کے دلائل پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے،"

علی حسن خان (نواب مترجم) — جولائی سنہ ۱۹۱۶ء

ایمانِ علوم طبعیہ — ص - ۹ - ۲۳

حوالہ ۲۸۶

"علوم طبعیہ میں وہ سب علوم داخل ہیں، جن میں موجودات عالم یعنی جمادات، نباتات، حیوانات سے بحث کی جاتی ہو... ہم ان اشیاء کا خلاصہ بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کو علمائے علوم طبعیہ نے طول طویل بحثوں کے بعد متعدد زبانوں میں تحقیق کر کے دنیا پر واضح کیا ہے،

عمادی، عبداللہ — رجب سنہ ۱۳۲۳ھ

مناظرہ کا ایک جلوہ — ص - ۱۰ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۲

"مناظرہ سے ہماری مراد "علم مناظر و مرایا" ہے، اور اس مضمون میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں

کہ مناظر کی ابتدائی حالت کیا تھی، یونانیوں نے کس درجہ تک اس پر ترقی کی، اور مسلمانوں نے اسے کس حد تک سجایا، ساتھ ہی ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ موجودہ علمی ترقی کو اسلامی تحقیقات سے کہاں تک فائدہ پہنچا، اور اہل یورپ نے اس بارے میں کس قدر مسلمانوں کے احسان مند ہیں۔

معین الدین احمد ندوی، دسمبر ۱۹۱۲ء

"شہاب ثاقب" ص - ۱۹ - ۲۳

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۹}$

شہاب ثاقب کے ٹکڑوں میں جو اجزاء فلکی میں داخل ہیں، کوئی ایسا مادہ نہیں ہے، جو زمین کے اشیاء میں موجود نہ ہو، بس اس سے معلوم ہوا کہ کواکب آفتاب اسی قسم کے مادوں سے مرکب ہیں،

ہادی محمد بی۔ اے، (مترجم) فروری ۱۹۱۱ء

"تمثل" ص - ۱۳ - ۲۳ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

ہم جب کسی چیز کا علم کرتے ہیں، تو ہم کو پہلے اس کا سادہ ادراک ہوتا ہے، اس کے بعد اس علم میں لذت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو وجدان کہتے ہیں، وجدان سے قوت ارادی کو تحریک ہوتی ہے، اور یہ علم کا آخری نتیجہ ہے، ادراک سادہ سے سائنس وجدان سے فنون لطیفہ و تصوف اور قوت ارادی سے مذہب و اخلاق پیدا ہوتے ہیں،

(ہربرٹ اسپنسر کے مضمون کا ترجمہ و خلاصہ)

مضامین تمدن و ثقافت

آزاد ابو الکلام اکتوبر ۱۹۰۵ء

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ کی سرپرستی

ص ۲۳ - ۳۴ - حوالہ $\frac{۲۷۹}{۲}$

مسلمانوں کے لیے یہ بات درحقیقت سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار بازی لے گئے۔ عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی جان و روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم و فنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی جرأت کو تک رہے ہیں۔"

اکرام اللہ خاں ندوی

"سلاطین ہند کے دربار قصر شاہی کا منظر" اپریل ۱۹۱۵ء

ص۔ ۲۱ - ۲۸

حوالہ ۲۸۵

شاہان مغلیہ کا ایک دستور یہ بھی رہا تھا کہ ہفتہ میں ایک روز انصاف و فریاد کے لیے مخصوص کر لیتے تھے۔ اس روز بادشاہ بجائے دیوان عام کے دیوان خاص میں اجلاس کرتا تھا، بادشاہ کے سامنے قاضی، مفتی اور ارباب عمائم جمع ہوتے تھے ...... خاندان تیموری سے سلطنت مغلیہ کے درباروں کا منظر پیش کیا گیا ہے،

اکرام اللہ خاں ندوی

ارباب تصنیف اور انکا علمی انہماک جون ۱۹۱۵ء

ص۔ ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۵

مسلمانوں کا تمام علمی سرمایہ وحشی فاتحین کے ہاتھوں بغداد و قرطبہ میں برباد ہوگیا، اور جو کچھ بچا تھا، وہ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی نذر ہوا، اس لیے مسلمانوں کے علم و فضل کی داستان سرائی کا موقع حاصل نہیں، لیکن تاہم جو کچھ موجود ہے، وہ مسلمانوں کے فخر و مباہات کے لیے کافی ہے، موضوع بالا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور مشہور مصنفین و محدثین کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

سلیمان ندوی (علامہ سید)

(۱) "عرب کے یورپین سیاح" ستمبر ۱۹۰۷ء

ص ۲۷ - ۳۱

حوالہ ۲۷۹/۴

سب سے پہلے اس اہم سفر کے لیے جس نے کمر ہمت باندھی وہ اسٹریلیا کا مشہور عالم نیوبھر تھا، ۱۷۶۲ء اور ۱۷۶۳ء میں اس نے یمن کا سفر کیا، اسکی نصف صدی کے بعد ۱۸۰۷ء میں یاڈیا جو اسپین کا رہنے والا تھا، عربستان کے سفر کے لیے روانہ ہوا، پہلے مصر آیا اور اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، اور علی بک عباسی اپنا نام رکھا، حلب پہنچا اور وہاں اس نے ایک شریف النسب مسلمان ہونے کا سرکاری سرٹیفکٹ حاصل کیا جس کی مدد سے مکہ معظمہ پہنچا .....

(۲) مسلمانوں کی بے تعصبی ستمبر ۱۹۰۷ء

"یہود اور دولت عثمانیہ ص ۲۲ - ۳۶

حوالہ ۲۷۹/۴

"مسلمانوں کی بے تعصبی کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات اس طرز حکومت

کے پیش کیے جا چکے ہیں، جو مدت ہوئی مٹ چکی ہے، مگر اس وقت ہم ایک موجودہ اسلامی سلطنت کی بے تعصبی دکھانا چاہتے ہیں، دولت عثمانیہ کا اپنی یہودی رعایا کے ساتھ کیا برتاؤ رہا، اس مضمون کا موضوع ہے۔

(۳) "مسلمان عورتوں کی بہادری" فروری ۱۹۰۸ء

ص ۵ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۵

"اسلام میں قدیم دستور قائم رہا، جہاد میں برابر مردوں کے ساتھ انکی عورتیں شریک رہتی تھیں، ایک موقع پر ایسا ہوا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھ سے مشک بھر بھر کر زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں، مگر اسی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ فضول اور بیکار عورتوں کا لے جانا سخت ناپسند فرماتے تھے۔

(۴) "روسی مسلمانوں کے کچھ حالات" مئی ۱۹۱۲ء

ص ۲۹ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۹

تاتاری مسلمانوں کا ایک اسلامی کتب خانہ شہر ترویکی (روس) میں واقع ہے جس کا نام 'نجات' ہے، گذشتہ سال کی جنوری سے لیکر اگست تک اس کتب خانہ سے گیارہ ہزار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا،

کیا اس سے تاتاری مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) "اندھوں کی تعلیم" جولائی ۱۹۱۱ء

اس کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، ص ۲۹ - ۳۱

حوالہ ۲۷۹/۸

"اندھوں کی تعلیم کا سب سے پہلے باقاعدہ سسٹم فرانس میں جاری ہوا" والنٹن ہوئی
نے ۱۷۸۴ء میں اندھوں کا سب سے پہلا مدرسہ پیرس میں قائم کیا، فرانسیسیوں کے
بعد انگریزوں نے ۱۷۹۱ء میں لیورپول میں ۱۷۹۲ء میں ایڈنبرگ اور اسکاٹ لینڈ
میں ۱۷۹۹ء میں، لندن میں اس قسم کے مدارس قائم کئے، اور اب یورپ کے ہر
ملک میں اندھوں کی تعلیم کا کافی سامان موجود ہے،

(۶) فرمانروایان اسلام کا دربار — اگست ۱۹۰۶ء

ص ۲۱ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۳

خلفائے راشدینؓ کے زمانہ تک خلیفہ اور غیر خلیفہ کی مجلس، تخاطب، گفتگو میں
کوئی امتیاز نہ تھا، ہر شخص خلیفہ کا نام لیتا تھا، ساتھ بیٹھتا تھا، گفتگو کرتا تھا،

"جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" سے کچھ اقتباسات کا ترجمہ

(۷) مسلمان اور سرجری — جولائی ۱۹۰۹ء

"زہراوی" — ص - ۲۳ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۴

"موضوع سے مختصر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد دنیائے طب کی عظیم شخصیت
امام زہراوی کی شخصیت، اس کے کمال فن اور مہارت سرجری پر روشنی ڈالی
گئی ہے، اس کی تصنیفات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

شبلی نعمانی (علامہ) — جولائی ۱۹۰۹ء

(۱) "ہندستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر" — ص ۳ - ۲۲

حوالہ ۲۷۹/۶

"اس معیار سے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو ہندوستان میں آئے کس شان
سے آئے اور ملک پر ان کا کیا اثر ہوا، لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم کو
بتانا چاہیے کہ ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن کی حالت کیا تھی، چونکہ ہم اس
مضمون میں صرف تیموری دور حکومت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسی زمانہ
سے پہلے کی حالت دکھانا کافی ہوگا"۔

(۲) اسلام اور تمدن و ترقی — جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ

ص ۱ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۱

"مخالفین اسلام نے بارہا کہا ہے کہ اسلام وحشی قوموں کو ایک حد تک شائستہ
اور مہذب بنا سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کے تمدن کے موافق نہیں اور اس وجہ وہ اعلیٰ درجہ
کا تمدن پیدا نہیں کر سکتا، اس مسئلہ کو طے کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ دریافت کیا جائے
کہ تمدن و ترقی کے بزرگ ترین اصول کیا ہیں، اور وہ اس میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟"

زینبی، سید علی — اکتوبر ۱۹۱۵ء

"اہل مصر کے قبرستان اور رسم تجہیز و تکفین" — ص - ۱ - ۱۸

حوالہ ۲۸۵

قدیم زمانہ میں اہل مصر اپنے مردوں کو کفن میں لپیٹ کر زمین کے اندر قبروں میں دفن
کیا کرتے تھے، لاش براہ راست مٹی میں یا کسی مٹکے میں بند کر کے رکھی جاتی تھی، کہتے ہیں
کہ یہ ابتدائی حالت انھوں نے قابیل کی تقلید میں حاصل کی تھی جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل
کر کے ایک کوے سے دفن کرنے کا طریقہ سیکھا تھا،

عبد السلام ندوی اپریل ۱۹۱۱ء

(۱) "اسلامی علوم و فنون اور یورپ" ص ۱۳ - ۲۶ حوالہ ۲۷۹/۸

"یورپ میں عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ کتابیں ہیں جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین سے منسوب کر دی گئیں، اس قسم کی کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات سے تھیں، دوسری وہ کتابیں جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا،

(۲) "اکابران قوم کا درجہ قوموں کی تاریخ میں" جولائی ۱۹۱۵ء

ص ۲۲ - ۲۸ حوالہ ۲۸۵

عام خیال ہے کہ بانیان سیاست کو زمانہ گذشتہ کے تاریخی سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن درحقیقت وہ بھی موجدین و مخترعین کی طرح دور ماضی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن ہیگل، ٹوسن اور کارلائل جیسے انشاپردازوں کی آنکھوں کو ان مدبرین کے انقلاب انگیز کارناموں نے بالکل خیرہ کر دیا۔

معین الدین ندوی (حاجی) جون ۱۹۱۵ء

"ایام جاہلیت اور خواتین عرب" ص - ۱۱ - ۲۵

"زمانہ جاہلیت کی عورتوں میں زیور اور بناؤ سنگھار کا بھی رواج تھا، بلکہ لوگ اسکو شرافت کی علامت سمجھتے تھے، چنانچہ حاتم طائی کو جب حالت قید میں ایک لونڈی نے طمانچہ مارا تھا، تو اس نے ان الفاظ میں حسرت ظاہر کی تھی

لو ذات سوار لطمتنی یعنی کاش مجھے کوئی کنگن والی طمانچہ مارتی۔

ادبیات

آیاتِ طیبات

از جناب وارث القادری

آیاتِ ذوالجلال ہیں قرآں کی آیتیں
آئینۂ کمال ہیں قرآں کی آیتیں

دستور لازوال ہیں قرآں کی آیتیں
عالم میں بے مثال ہیں قرآں کی آیتیں

فکر و نظر کو نور بصیرت عطا کیا
روشن گر خیال ہیں قرآں کی آیتیں

جس کے طلوع کو نہیں اندیشۂ غروب
وہ مہر لازوال ہیں قرآں کی آیتیں

ابلیس کے فریب کو معدوم کر دیا
شعلہ پئے ضلال ہیں قرآں کی آیتیں

واللہ زندگی کا سہارا انہی سے ہے
مومن کی جان و مال ہیں قرآں کی آیتیں

سارے جہاں میں "نیر عظمیٰ" یہی تھیں اور
اب "آفتاب حال" ہیں قرآں کی آیتیں

فطرت کے جزو خاص ہیں اسلام کے اصول
انساں کے حسب حال ہیں قرآں کی آیتیں

بزم جہاں کو مشرقِ ایماں بنا دیا
کیا حسن کمال ہیں قرآں کی آیتیں

باطل کا سر کچلنے کو آمادہ آج بھی
بے جنگ، بے جدال ہیں قرآں کی آیتیں

کفار کیوں "نہ لیس کلام البشر" کہیں
خالق کی بول چال ہیں قرآں کی آیتیں

"سبعہ معلقہ" کے قصیدے کدھر گئے
اور آج تک مثال ہیں قرآں کی آیتیں

گنجِ شرف، پیامِ اخوت، رہِ نجات
"فی کافۃ الرجال" ہیں قرآں کی آیتیں

کتنی بھی ہوں بلائیں ٹپکتی رہیں گی سر
مومن کے حق میں ڈھال ہیں قرآں کی آیتیں

صدقہ ہے آپؐ کا کہ زمانہ میں ضوفگن
یا صاحب الجمال ہیں قرآں کی آیتیں

جس کا ثمر خدا و پیمبرؐ کا لطفِ خاص
ایماں کا وہ نہال ہیں قرآں کی آیتیں

وارث انھی کے سایہ میں انسانیت پلی
وہ پرچمِ ہلال ہیں قرآں کی آیتیں

بیانِ حقیقت

از جناب عروج زیدی

یہ تخلیقِ جہانِ مور و ماہی
دکھائی تھی انھیں عالم پناہی

اوامر کو دیا رنگِ نواہی
دلِ گمراہ! یہ تیری تباہی!!

درِ خیرالوریٰ ہی ایک در ہے
جہاں دھلتی ہے ماتھے کی سیاہی

عرب کے سار بانوں کا مقدر
جنھیں بخشا گیا اعزازِ شاہی

علم بردار امن و عافیت ہے
احد کا اشجعِ عالم سپاہی

زباں کھولوں بھی کیوں بیش و کم پر
مرا حصہ بہ تائیدِ الٰہی

خدا والوں کا تکیہ نا خدا پر
قیامت ہے ہماری کم نگاہی

محبت مائلِ الفقر فخری
سیاست کو غرورِ کج کلاہی

مرے سر پر ہے دامانِ محمدؐ
یہ فطرت کا سلوکِ خیر خواہی

وہ جن کے دل ابھی اجلے نہیں ہیں
وہ کیا دھوئیں گے ماتھے کی سیاہی

غلامِ صاحبِ ہر دو سرا ہوں
مری ٹھوکر پہ تاجِ بادشاہی

عروج! ایمان بھی ناقص ہے نظر بھی
تباہی! اور پھر ایسی تباہی!!

تضمین بر کلام اقبال

از جناب ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خانصاحب منشاء

ہے میرے دم سے ہاؤ ہو میکدۂ حیات میں
جذب و جنونِ عشق ہے میرے تصرفات میں
مجھ سے ہے ہمہمہ تمام عالمِ شش جہات میں
میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

میرے ہی دم سے رنگ ہے محفلِ کائنات میں
حسنِ عمل کا دخل ہے میرے کمالِ ذات میں
خوبیٔ خاص ہے نہاں میری ہر اک بات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

فیضِ وفورِ شوق سے حوصلے ہیں مرے بلند
ڈال رہا ہوں آج میں ماہ و نجوم پر کمند
میرے لیے ہے وجہ ناز میرا یہ قلبِ دردمند
"گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں"

اپنی صفات ہی کا رنگ تو نے ہے مجھ میں بھر دیا
خاک کے پتلے کو شرف کتنا بڑا عطا کیا
تجھ سے مگر مجھے گلہ اتنا ہے اے مرے خدا
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھکو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

باب التقریظ والانتقاد

الجزء الاول

من

الابواب والتراجم للبخاری

از

مولوی ضیاء الدین حسن صاحب اصلاحی

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۰۰، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ (۱) مکتبہ یحیویہ مظاہر العلوم سہارنپور (۲) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (سعودی عرب)

صحیح بخاری حدیث کی سب سے معتبر و مستند کتاب ہے، اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے امت نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے متعلق بے شمار کتابیں اور شرحیں لکھی گئی ہیں، اور وہ ہر زمانہ میں درس و تدریس کا لازمی جزو رہی ہے۔

منجملہ دیگر اسباب کے صحیح بخاری کی دوسری کتب حدیث پر فضیلت و تقدم

کی ایک اہم وجہ اس کے ابواب و تراجم بھی ہیں، جو امام بخاریؒ کی عظمت شان، جلالت قدر، جودت طبع، ذہن رسا، دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، بالغ نظری، کثرت استحضار، وفور علم، تفقہ و اجتہاد اور استخراج و استنباط وغیرہ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں، اور وہ محدثین اور علمائے فن کے غور و فکر کا مرکز رہے ہیں، اور انھوں نے ان کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کی ہے۔

صحیح بخاری کی بعض شرحوں میں ابواب و تراجم کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، اور ان کے متعلق مستقل کتابیں اور علیحدہ رسالے بھی لکھے گئے ہیں، مگر متقدمین کی اکثر کتابوں کی طرح یہ اب ناپید ہیں، اور محض متداول شرحوں میں کہیں کہیں ان کے حوالے ملتے ہیں، ہندوستان کے علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے صحیح کے ابواب و تراجم پر بیش قیمت رسالے تحریر کیے ہیں، جو طبع ہو چکے ہیں۔

موجودہ زمانے کے نامور محدث مولانا محمد زکریا صاحب کی عمر گرامی حدیث نبوی کی خدمت اور درس و تدریس میں گذری ہے، اور انھوں نے کئی اہم کتب حدیث کے شروح و حواشی اور ان سے متعلق مفید اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں، صحیح بخاری بھی عرصۂ دراز تک انکے درس و مطالعہ میں رہ چکی ہے، اسلیے اسکے مباحث پر انکی نظر نہایت عمیق اور گہری ہے، اس سلسلہ میں انکو ابواب تراجم کے موضوع پر بھی غور و فکر کا موقع ملا، اور وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج قلمبند کرتے رہے۔

یہ عظیم الشان علمی و دینی ذخیرہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی حیثیت دراصل بخاری انسائیکلو پیڈیا کی ہے، اس کے شروع میں ابواب و تراجم کے متعلق بڑے اہم اصول تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے ان کو علحدہ ایک جلد میں

پہلے شائع کیا گیا ہے، یہ چار حصوں میں منقسم ہے،

پہلے حصہ میں بخاری کے تراجم کی اہمیت اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ ہے، دوسرے میں ان مجمل اصول و قواعد کا ذکر ہے جو بخاری سے متعلق کتابوں اور شرحوں میں تراجم کے بارہ میں بیان کیے گئے ہیں، تیسرا حصہ اسی کی تفصیل ہے، اس میں نمبروار ستر اصولوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے،

چوتھے حصہ میں ان اقوال و آراء کا جواب دیا گیا ہے جو ابواب و تراجم کی عدم مناسبت کے متعلق ظاہر کیے گئے ہیں، آخر میں ان ابواب و تراجم کا جدول دیا گیا ہے جن میں مسند حدیثیں درج نہیں ہیں، یہ جدول شیخ الہند کے رسالہ تراجم سے ماخوذ اور حسب ذیل چار نوعیتوں کا ہے:-

(۱) وہ ابواب و تراجم جو گو مسند حدیثوں سے خالی ہیں مگر ان میں کوئی آیت، حدیث، اثر یا سلف کا قول موجود ہے،

(۲) وہ ترجمے جن میں نہ مسند روایت ہی ہے، اور نہ کوئی اور حدیث و آیت وغیرہ مگر نفس آیات ان کے ابواب کا عنوان ہیں،

(۳) ایسے تراجم جو مسند روایتوں سے بھی خالی ہیں، اور ان میں کوئی حدیث واثر اور آیت بھی درج نہیں ہے، بلکہ مصنف نے ان کا ترجمہ اپنے قول کو بنایا ہے،

(۴) وہ ابواب جو بلا ترجمہ ہیں،

شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک پُرمغز مقدمہ ہے، اس میں تراجم کی اہمیت، ان کے متنوع مقاصد، ان کے غموض و خفا کے اسباب، صحیح بخاری کے ساتھ علماء کے غیر معمولی اشتغال و اعتناء، ابواب و تراجم کے متعلق

قدیم تصنیفات اور زیر نظر کتاب کے بعض خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے،

اس رسالہ کے تیسرے حصہ میں جن ستر اصول تراجم کا مفصل ذکر ہے، وہ مصنف کی کتاب لامع الدراری کے مقدمہ میں بھی شامل ہیں، ان میں زیادہ تر شاہ ولی اللہ اور شیخ الہند کی کتابوں، حافظ ابن حجر، علامہ عینی، قسطلانی اور سندھی کی شروح و حواشی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا انور شاہ کشمیری، کے افادات سے ماخوذ و مستنبط ہیں، لیکن متعدد اصول خود صاحب رسالہ کے فکر و مطالعہ اور ذوق و وجدان کا نتیجہ ہیں،

یہ حصہ مصنف کے رسوخ فی الحدیث، وسعت علم و نظر اور کثرت مطالعہ و تدبر کا شاہکار ہے،

جن ابواب و تراجم سے عام شارحین سرسری گذر گئے ہیں یا ان کی ایسی دور از کار تاویل و توجیہہ کی ہے، جس نے امام بخاری کی ذات کو ہدف طعن و اعتراض بنا دیا ہے، ان ابواب میں مصنف علام کے ذوق سلیم اور نکتہ سنج ذہن نے عجیب عجیب حقائق و معارف کا سراغ لگایا ہے، اور ان کی حدیثوں سے مناسبت کے ایسے دقیق پہلو اور لطیف نکتے واضح کیے ہیں، جن سے امام صاحب پر عائد کردہ الزامات نہ صرف رفع ہو گئے ہیں، بلکہ وہ ان کی عظمت و کمال کی دلیل بن گئے ہیں،

جن ابواب و تراجم اور ان کی احادیث کے درمیان عدم مناسبت کو عموماً نقل کی مسامحت، امام صاحب کے وہم یا مسودہ کی تکمیل اور باقاعدہ ترتیب سے پہلے ان کی وفات یا ان کی اپنی شرط اور معیار کے مطابق حدیث نہ ملنے یا راویوں کے

اضافہ و تصرف وغیرہ کا نتیجہ بتایا جاتا ہے، مولانا نے اس طرح کے تمام ابواب وتراجم اور ان کی حدیثوں کے درمیان ایسی دلنشین مناسبت بیان کی ہے کہ ان سب الزامات کی مکمل تردید ہوگئی ہے اور وہ خود شارحین کے قصور فہم اور قلت تدبر وغیرہ کا نتیجہ معلوم ہونے لگے ہیں، ؎

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کتاب کا زیادہ حصہ اخذ و اقتباس پر مشتمل ہے، اور مصنف علام نے عموماً متقدمین کے اقوال اور اکابر کے بیانات کے دائرے کے اندر رہ کر انکی روشنی میں بخاری کے ابواب و تراجم کے اسرار و غوامض حل کیے ہیں، مگر جہاں یہ صورت ممکن نہیں تھی تو وہاں اپنے نتائج تحقیق بیان کیے ہیں، اور کہیں کہیں پورے ادب و احترام کے ساتھ اسلاف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، یا انکے مختلف آراء میں تطبیق و ترجیح دیکر اپنی مرجح رائے تحریر کی ہے.

مصنف نے بالکل غیر جانب داری سے بخاری شریف کا مطالعہ کیا ہے، اسلیے ان کو عام شارحین کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے اور ان کے آراء پر نقد و جرح کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے، ان کی حق طلبی اور انصاف پسندی نے ان کو علامہ عینی کے مقابلہ میں حافظ ابن حجر کی ہمنوائی اور اپنی جماعت کے ممتاز بزرگ شیخ الہند سے بھی کہیں کہیں اختلاف کرنے پر آمادہ کر دیا ہے،

دوسرے بزرگوں کے جو اصول تحریر کیے ہیں ان کی توضیح کے لیے ان کے حوالے سے مثالیں بھی نقل کی ہیں، اور جن مثالوں میں انکو کوئی غلطی نظر آئی ہے، ... اسکی تصحیح کر دی ہے، اور اصول و مباحث کے سلسلہ میں ان بزرگوں کے یہاں مثالیں نہیں

ملی ہیں، خود تلاش و تفحص کر کے ان کی مثالیں دی ہیں، کسی بزرگ کے اصول کے ضمن میں اس کی تائید میں ملنے والے دوسرے بزرگوں کے بیانات بھی نقل کیے ہیں اور خود اپنے اصولوں کی تائید میں اگر متقدمین کے یہاں اس نوعیت کے معلومات ملے ہیں تو ان کو ذکر کر دیا ہے،

جن ابواب و تراجم کے مختلف الفاظ مروی ہیں ان کی تصریح اور مرجح روایت کی نشاندہی کی گئی ہے،

بعض اصولوں میں باہم بڑی یکسانیت ہے، اس لیے ان کے دقیق فرق کو واضح کر کے التباس رفع کر دیا گیا ہے.

غرض بخاری کے ابواب و تراجم کے متعلق مختلف کتابوں میں جو کچھ منتشر مواد تھا وہ سب اس میں مفید اضافہ و تشریح کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب نہایت جامع اور معلومات افزا ہے،

اس کتاب کے محاسن کے ساتھ اس کے مسامحات کا مختصر ذکر اس لیے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آئندہ اس کی تصحیح میں مدد ملے گی،

صفحہ ۱۰ پر صاحب نزہۃ الخواطر کے حوالہ سے علامہ شبلی مرحوم کی ایک مسامحت کا ذکر ہے کہ "انھوں نے گلشن ہند کے حاشیہ میں شیخ ولی اللہ دہلوی المتخلص باشتیاق کو جو شعر و تصوف اور علم تفسیر میں صاحب کمال اور شیخ عبدالاحد بن محمد سعید سرہندی کی اولاد میں تھے، اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، لیکن اصلاً یہ صاحب گلشن ہند کی غلطی ہے، مولانا شبلی نے خود اس قسم کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ انھوں نے گلشن ہند کے اشتباہ میں ڈالنے والے

بیان کی تردید بھی نہیں کی ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصولوں کے سلسلہ میں صفحہ ۴۳ و ۴۴ پر بارہویں اور تیرہویں اصول کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ انکو ایک ہی اصل میں شامل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ خود مصنف نے شیخ الہند کے متعلق بیان کیا ہو کہ وہ ان کو ایک ہی اصل مانتے تھے،

بعض جگہ کتابوں کے نام اتنے مختصر و مبہم ہیں کہ ان کی جانب ذہن آسانی سے نہیں منتقل ہوتا، مثلاً صفحہ ۳۲ پر حدیث للا وسط کو اگر حدیث للطبرانی فی الاوسط لکھا جاتا تو ذہن آسانی سے منتقل ہوجاتا،

عبارتوں کے نقل و اقتباس میں حذف و ترمیم کی وجہ سے کہیں کہیں مفہوم میں تبدیلی یا کم از کم ان کی وضاحت مشکل ہوگئی ہے،

بخاری کے ابواب کے ناموں کو مختصراً ذکر کرنے کی وجہ سے بھی کہیں کہیں مصنف کا منشا پوری طرح واضح ہونے سے رہ گیا ہے،

طباعت میں صحت کے اہتمام کے باوجود بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، چند غلطیاں نقل کی جاتی ہیں، تاکہ دوسرے اڈیشن میں ان کی تصحیح کردیجائے،

غلط	صحیح
ص ۲۳ - باب اثنان فما فوقہا جماعۃ	فوقہما
ص ۲۷ - یہدی طالب الحدیث علی ہذا النوع	الی
ص ۳۲ - باب المزایدہ	باب بیع المزایدۃ
ص ۳۹ - بین ماروی عن عمر بن الخطاب وامیۃ رضی اللہ عنہما	ابنہ
ص ۴۰ - جعلہا الی شیخ الہند	جعلہا شیخ الہند
ص ۴۱ - باب ذلک المرأۃ	ذلک (اس کا پورا نام باب ذلک المرأۃ نفسہا اذا تطہرت من الحیض ہے پورا نام نہ لکھنے سے بڑا اشتباہ ہوگیا ہے)
ص ۷۱ - فی کم تصلی المرأۃ من الباب	من الثیاب
ص ۷۲ - ویقول الحسن قال زفر	ویقول الحسن قال بہ زفر
" - باب ابواب الابل	باب ابوال الابل
ص ۷۴ - باب الصلوۃ	باب الصلوۃ فی الخفاف
ص ۷۸ - رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اصحابہ فتاخرہ	تاخراً
ص ۹۲ - باب علامۃ المنافق	باب علامات المنافق
ص ۹۹ - باب وجوب الباب	باب وجوب الصلوۃ فی الثیاب
ص ۱۱۰ - تقدم فی الفائدۃ الثالثۃ	الثانیۃ
ص ۱۲۵ - باب الحکم من قدف مملوکہ	اثم - قذف
ص ۱۲۷ - باب المہر وجزاء الصید	المحصر
ص ۱۲۸ - من استاجر اجیراً فبین والاجل	لہ الاجل

ل آخر میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسالہ سے جو جدول نقل

کیا گیا ہے۔ اس میں کہیں کہیں حاشیے میں اختلاف نسخ کا ذکر اور اس فرق کی تصریح کی گئی ہے، جو اصل اور جدول کے درمیان ہے، مگر اس قسم کے اور متعدد ابواب پر حواشی تحریر کرنا رہ گیا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والی کتابوں میں مفصل فہرست اور اسماء و اعلام کا اشاریہ شامل رہتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ یہ اہم اور بیش قیمت کتاب فہرست اور انڈکس سے خالی ہے،

تذکرۃ المحدثین

(حصہ اول)

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام جن میں صحاح ستہ کے تمام مصنفین بھی داخل ہیں، مثلاً امام مالک، امام ابوداؤد طیالسی، امام عبدالرزاق بن ہمام، امام عبداللہ ابن زبیر حمیدی، امام ابوبکر بن ابی شیبہ، امام اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل، امام عبداللہ دارمی، امام بخاری، امام مسلم، امام ابن ماجہ، امام ابوداؤد سجستانی، امام ترمذی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین

ضخامت ۳۳۰ صفحات، قیمت ۹ روپیے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

جناب خلیل الرحمن صاحب اعظمی تقطیع بڑی، ضخامت ۴۵۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد عہ۱۲ پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

زبان و ادب میں ترقی پسندی کوئی نئی چیز نہیں، ہر دور کے ترقی پسند خیالات و رجحانات کا اثر اس دور کے ادب پر پڑنا بالکل قدرتی ہے جس سے اردو بھی مستثنیٰ نہیں، اردو ادب میں ترقی پسند خیالات کی ابتدا سر سید، غالب، حالی، آزاد شبلی اور اقبال کی نظم و نثر سے ہوئی، اور اردو زبان نے خیالات اور طریقۂ تعبیر دونوں حیثیتوں سے ایک نیا قالب اختیار کیا، مگر اس کا دائرہ مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی، تعلیمی اور اردو زبان و ادب کی اصلاح تک محدود تھا۔ اس کے بعد بین الاقوامی انقلابات و سیاسیات کا دور شروع ہوا، اور سوویٹ روس کے انقلاب سے ساری دنیا گونج اٹھی، اور ایک طبقہ کی نگاہ میں کمیونزم ترقی پسندی کا معیار قرار پائی، اس لیے دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی اس سے متاثر ہوئی، اور چند برسوں کے اندر اس میں ترقی پسند ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا، لیکن یہ ادب تمام تر کمیونسٹ ادب کی صدائے بازگشت تھا، اس لیے اس کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں اس کے حصہ میں آئیں، اور ابتدائی دور میں

اس میں بڑی بے اعتدالی ہوئی، ترقی پسند نوآموز شاعروں اور ادیبوں نے جو کمیونزم کو سمجھتے بھی نہ تھے، صرف بازار میں اس کا چلن دیکھ کر اس کی لے میں لے ملانے لگے تھے، اس کی بڑی مکروہ تصویر پیش کی، اس کے انتہا پسندوں نے اس ادب کو محض کمیونزم کے پروپگنڈے کا ذریعہ اور ہر قدیم چیز سے بغاوت کو شعار بنا لیا، اور تعمیر کے بجائے تخریب کے نعرے لگانے لگے، اور عوامی ادب کی دھن میں یا عجز کی بنا پر اردو زبان کی پرانی روایات کو بھی نظر انداز کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیا ادب خیالات اور ادبی پہلو دونوں حیثیتوں سے سنجیدہ ادبی حلقوں میں اعتبار پیدا نہ کر سکا، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس میں اعتدال پیدا ہونے لگا، اور اس کے سنجیدہ ادیبوں نے تعمیری اور ادبی دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا، در حقیقت یہی ترقی پسند ادب کا صحیح نمونہ ہے، اس کی تاریخ پر مضامین تو بہت لکھے گئے، لیکن غالباً کوئی مستقل کتاب نہ تھی، اس لیے لائق مصنف نے اس کو اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کا موضوع بنایا، اب انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے،

یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ ہے، دوسرے میں اس کے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسرے میں ترقی پسند ادیبوں کے تنقیدی خیالات پر تبصرہ ہے، مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لیے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگھالا ہے، اور بڑے اعتدال و توازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے، اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا،

علماء اہل سنت - از مولانا محمود احمد صاحب قادری تقطیع بڑی، ضخامت ۳۴۴ ص، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت للعہ پتہ:- خانقاہ قادریہ اشرفیہ اسلام آباد، بھوانی پور، پوسٹ سنبر ساڈیہ ضلع مظفر پور، بہار۔

یہ بریلوی عقیدے کے علماء کا تذکرہ ہے، اہل سنت میں تو شیعہ کے علاوہ ائمہ اربعہ کے مقلد، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث سب داخل ہیں، لیکن بریلوی حضرات نے غالباً اہل بدعت کے مقابلہ میں اپنے لیے اہل سنت کی اصلاح مخصوص کر لی ہے، جو لوگ ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں، ان کو وہ اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں، ان میں بھی بڑے بڑے مشائخ و علماء گذرے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم لوگوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ لکھنے کی ضرورت تھی، علماء اہل سنت انہی کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں بہت سے معروف و غیر معروف علماء کے حالات آگئے ہیں، مگر بعض ایسے علماء کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی حیثیت سے اس زمرہ میں نہیں آتے، مثلاً مولانا بحر العلوم اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی، مولانا گنج مراد آبادی تو اپنے دور کے بہت بڑے متبع سنت اور مخالف بدعت تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے علماء ہیں جو بریلوی علماء کے زمرہ میں نہیں آتے، ہمارے لائق دوست مختار الدین احمد صاحب آرزو کے متعلق اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ وہ بھی علمائے اہل سنت میں ہیں، اگر ایسا ہے تو لائق مبارکباد ہیں،

جن کو بریلوی اہل سنت سمجھتے ہیں، ان کے بھی دو طبقے ہیں، ایک متین و معتدل جو اپنے عقائد و رسوم کے تو پابند ہیں، لیکن کسی کو برا بھلا نہیں کہتے، انکے

تعلقات دیوبند اور اہل حدیث سب سے ہیں، مثلاً پھلواری اور فرنگی محل کے
علماء، دوسرا طبقہ اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر و تفسیق بھی ضروری سمجھتا
ہے، یہ کتاب بھی ان پر طنز و تعریض سے خالی نہیں ہے، بعض باتیں بالکل بے بنیاد
ہیں، مثلاً شاہ عبد اللطیف سنبھلی بہادر شاہ ظفر کے لڑکے تھے، ان خامیوں سے
قطع نظر کتاب اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے علماء و مشائخ
اور اصحاب علم و کمال کے حالات محفوظ ہوگئے،

نقشہائے رنگ رنگ۔ از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۵۱۴ صفحات۔ کاغذ، کتابت و طباعت
نفیس، قیمت سات روپے۔ پتہ: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

غالب کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کا اردو کلام ہے، لیکن اس کو وہ
"بے رنگ" اور اپنے کمال کا اصلی تماشاگاہ فارسی کے "نقشہائے رنگ رنگ"
کو سمجھتے تھے، اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے فارسی کلام میں اہل زبان کا لطف ہے،
اور وہ تخیل کی رفعت و ندرت میں اردو کلام سے بڑھا ہوا ہے، لیکن ان کے اردو
کلام کے تخیل کی نزاکت بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار
ہو جاتا ہے، اور فارسی کے تو جاننے والے بھی اب بہت کم رہ گئے ہیں، اس لیے اردو
کلام سے لطف اٹھانے والے تو بہت ہیں، لیکن فارسی کلام کے سمجھنے والے بھی مشکل
سے ملیں گے، لائق مترجم نے اردو داں طبقہ کو غالب کے فارسی کلام سے مانوس کرنے
کے لیے ان کی غزلوں کے منتخب اشعار اور ان کی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے
مقابل میں اصل فارسی اشعار بھی دیدیے ہیں، انتخاب کا معاملہ ذوقی ہے، مگر اس انتخا

میں خوش ذوقی نمایاں ہے، اس ترجمہ میں مترجم کے والد ماجد مولوی ضیاء احمد صاحب
بدایونی کا مشورہ شریک رہا ہے جو فارسی زبان کے مسلم اساتذہ میں ہیں، اس لیے
ان کا نام ترجمہ کی صحت اور خوبی کی پوری ضمانت ہے، امید ہے کہ اردو کے
اصحاب ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

انوار سحر۔ از ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، صدر شعبۂ علوم مشرقی
(عربی و فارسی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰۱ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت
نفیس، قیمت مجلد للعہ۔ پتہ: (۱) ادارہ صبح ادب، گلی نظام الملک
اردو بازار دہلی (۲) ادارہ صبح ادب، بی، این ورما روڈ، لکھنؤ۔

انوار سحر ڈاکٹر انوار الحسن کے کلام کا مجموعہ ہے، ان کی علمی حیثیت سے
تو واقفیت تھی، لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت ہمارے لیے نیا انکشاف ہے،
اور اس کمال کے ساتھ کہ ان کا کلام کہنہ مشق شعراء کے کلام کی ہمسری کرتا ہے،
اس کی نمایاں خصوصیت اس کی دردمندی اور سوز و تپش ہے، جو ان کی
جوانمرگ اہلیہ کی وفات کا نتیجہ ہے، غالباً اسی حادثہ نے ان کو شاعر بنایا ہے،
اس لیے کہ پورا کلام درد و الم میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے
اس تاثر کے ساتھ ادبی محاسن سے بھی پوری طرح آراستہ اور دردمند
اصحاب دل کے مطالعہ کے لائق ہے،

م

مفتاح التبلیغ۔ افادات مولانا محمد حسن خاں صاحب میواتی، ترتیب مولوی
ابو عبید اللہ حکیم محمد حسن خاں صاحب میواتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت
اچھی، صفحات ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے، ناشر

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶

اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے مندرجۂ ذیل چھ نمبروں کی مفصل تشریح و توضیح کی گئی ہے (۱) کلمۂ طیبہ (۲) نماز (۳) علم و ذکر (۴) اکرام مسلم (۵) اخلاص نیت (۶) تفریغ وقت اور ان شش گانہ اصولوں کی اہمیت، ضرورت اور ان کے فضائل کی آیتیں اور حدیثیں جمع کرکے امت کے منصبِ دعوت و امامت اور دینی جد وجہد کی اہمیت بیان کی گئی ہے، اور آخر میں تبلیغی جماعت کے بعض خاص اشغال و امور نظم جماعت، تقسیم کار، ترتیبِ اوقات، امیر و مامور کے فرائض، سفر، گشت، مجالس و اجتماعات کے آداب اور تقریر، بیان اور تبلیغ و دعوت وغیرہ کے متعلق ضروری ہدایات تحریر کی گئی ہیں اور ان کے متعلق مولانا محمد الیاسؒ کے ارشادات و ملفوظات بھی نقل کیے گئے ہیں، [کزرعٍ اخرج شطأہ] میں شطأ' کا ترجمہ بال صحیح نہیں کیا گیا ہے صحیح ترجمہ انکھوا، پٹھا اور موئی وغیرہ ہوگا، آیت قرآنی کے کلمۂ طیبہ کا مفہوم اصطلاحی کلمۂ طیبہ میں حصر کرنا اور جہاد و قتال کی آیتوں کو تبلیغی جماعت کے دوروں اور چلوں پر منطبق کرنا محل نظر ہے، آیت ضرب اللہ مثلاً کلمۃً طیبۃً کو غلط نقل کیا گیا ہے، کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے، اور یہ نہ صرف تبلیغی جماعت کے کارکنوں بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہے۔

حیات مسلم[۱]، چاند تارے[۲] اور آسمان، اسلام کیوں[۳]۔ مرتبہ مولانا سید محمد میاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۱۱۲، ۴۸، ۳۲، قیمت عہ، ۵پ، ۵۰ پیسے، ۲۰ پیسے۔ پتے (۱) الجمعیۃ بکڈپو، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (۲) کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶

پہلے کتابچہ میں مسلمان کی پیدائش سے وفات تک کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق اسلامی ہدایات و تعلیمات بیان کی گئی ہیں، اس میں عبادت، معاملت، اخلاق اور معاشرت و معیشت وغیرہ کے متعلق ضروری احکام آگئے ہیں، ضمناً ان رسوم اور بدعات وغیرہ کی بھی تردید کی گئی ہے، جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہوگئی ہیں، اور جن کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، دوسرے میں خلائی پرواز کے نتیجے میں چاند، تاروں اور آسمان کے بارہ میں پیدا شدہ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، اور ان کے متعلق قدیم علمائے ہیئت و فلاسفہ اور جدید سائنسدانوں کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، تیسرے میں اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کے امن و سلامتی کے ضامن ہونے کی وضاحت کی گئی ہے، ان کتابچوں کی زبان آسان و عام فہم اور پیرایۂ بیان دلکش ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد